30
ہدف زندگی
آیت اللہ شہید استاد مرتضٰی مطہریؒ
شہید مطہری فاونڈیشن (پاکستان)
www.shaheedmutahhari.com

ہدفِ زندگی

آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہریؒ

مترجم

کوثر عباس حیدری

ناشر

شہید مطہری فاؤنڈیشن لاہور پاکستان

نام کتاب	ہدف زندگی
مصنف	آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہری
مترجم	کوثر عباس حیدری
کمپوزنگ	انس کمیونیکیشن لاہور 0300-4271066
ناشر	شہید مطہری فاونڈیشن
زیرِ اہتمام	ابوظہیر

ملنے کا پتہ:

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0321-4971214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد

0333-5234311

فہرست مضامین

بسمہ تعالیٰ

عرضِ ناشر

اس وقت جو کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے یہ استاد بزرگوار شہید مرتضیٰ مطہری کے پانچ دروس کا مجموعہ ہے جو ''جہان بینی اسلامی'' (کائنات کے بارے میں اسلام کا تصور) کے دروس پر مبنی ''ہدفِ زندگی'' کے عنوان سے 1351ء شمسی (ایرانی سال) میں دیئے گئے تھے۔

ان سالوں میں اس عنوان یعنی اسلام کا نظریہ کائنات کی تدوین اور نوجوان نسل کیلئے اس کا تعارف مذہبی مفکرین کی خصوصی توجہ کا مرکز تھا، استاد شہید اس ضرورت اور اپنے چند شاگردوں کی درخواست کے پیش نظر ایک محدود سی نشست میں جس میں طلبہ کی تعداد دس سے زیادہ نہیں ہوا کرتی تھی جہان بینی اسلام کے تعارف اور اس کے بنیادی خطوط کو زیر بحث لائے۔

استاد محترم کا طریقہ کار عموماً یہ ہوا کرتا تھا کہ ہمیشہ ایسے مطالب جن کی ضرورت محسوس کرتے، چھوٹے اور بڑے تمام درسوں میں بار ہا پیش کرتے تا کہ ان پر مکمل تحقیق و گفتگو ہو سکے اور وہ معاشرے میں محکم طور پر قائم ہو جائیں۔ پھر اس بحث کو اپنے قلم کے ذریعے تحریر میں لے آتے جیسا کہ آپ نے مقدمہ بر جہان بینی اسلامی 1357ء شمسی کی گرمیوں کے آخر میں خلاصہ کے طور پر سات حصوں میں تحریر کیا جو تدریجاً طبع ہوا۔

بہر حال یہ یادگار مجموعہ آپ کے انہی محدود و مختصر دروس کا حصہ ہے جن

کو 1351ء شمسی میں کیسٹ سے لکھا گیا، جن کی کیٹس بھی اب دستیاب نہیں۔

جس چیز نے ہمیں ان درسوں کی طباعت پر ابھارا وہ ایک تو شہید استاد مطہری رحمۃ اللہ علیہ کی وہ پاک اور مطہر سوچ ہے جس کا سر چشمہ اسلام ہے اور دوسرے حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کی ازحد تاکید ہے کہ نوجوانوں کو استاد شہید کے علوم سے بیشتر استفادہ کرنا چاہیے جو آج کے ایران کے اسلامی معاشرے کیلئے ایک رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں، بنا برایں ہم نے یہ اپنا فریضہ سمجھا کہ ان درسوں کے متن کو بغیر کسی قطع و برید کے (سوائے عبارتوں کی اصلاح کے) استاد شہید مطہری رحمۃ اللہ علیہ کے افکار و نظریات سے دلچسپی رکھنے والوں کی خدمت میں پیش کیا جائے، ہمیں امید ہے کہ آپ اسی صورت میں اس کو شرف قبولیت بخشیں گے۔

ان درسوں میں استاد نے ''ہدف زندگی'' کو قرآن اور مکتب اور انسانی افکار کی روشنی میں موضوع تحقیق قرار دیا ہے۔ تمام زاویوں سے بحث کی ہے اور انسانی افکار کو مختلف وادیوں میں گھماتے ہیں تاکہ جس طرح قرآن چاہتا ہے وہ ہدف زندگی واضح ہو جائے اور اسی کو زیر نظر قرار دیا جائے تو پھر زندگیاں پر جوش اور نورانی ہو جائیں اور زندگی کے میدان میں ایک نیا انسان اور ایک نیا معاشرہ وجود میں آ جائے یعنی وہی چیز جس کی انسانیت کو آج تلاش ہے۔

یہ سب درد والم اور رنج وغم جس نے آج انسانیت کو تلخ کر کے رکھ دیا ہے اسی وجہ سے تو نہیں کہ انسان نے ابھی تک زندگی کے مقصد ہی کو نہیں پہچانا؟

ہمارے آج کے معاشرے کی نوجوان نسل کو جس قدر آج اس حساس بحث کی ضرورت ہے پہلے کبھی نہ تھی تاکہ وہ اپنے روحانی و معنوی مقدس انقلاب کو مقصد زندگی کی صحیح شناخت کے ساتھ بہتر طریقے سے جان سکے اور اپنی مادی تاریک زندگی کیلئے چراغ راہ قرار دے۔

☆☆☆☆☆

پہلی تقریر

تخلیق کا مقصد!

ایک بنیادی مسئلہ جس پر تحقیق ضروری ہے زندگی کا مقصد، انسان کو ہمیشہ یہ مسئلہ درپیش رہا ہے کہ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ انسان کو کیوں زندگی ملی؟ بالفاظ دیگر حقیقت میں زندگی کا اور زندگی میں مقصد کیا ہے؟

دوسری طرف اگر اسلامی پہلو کے حوالے سے بحث کرنا چاہیں تو یوں کہیں گے (اور بحث کی بنیادی بھی یہی چیز ہے) کہ انبیا علیہم السلام کی بعثت کا مقصد اور اصل غرض و غایت کیا ہے؟ مسلمہ بات ہے کہ انبیا کی بعثت کا مقصد ان افراد کی زندگی کے مقصد سے جدا نہیں ہے جن کیلئے انبیاء معبوث ہوئے، ان افراد کی زندگی کے مقصد سے جدا نہیں ہے جن کیلئے انبیا مبعوث ہوئے اس لئے کہ انبیا لوگوں کو ایک خاص ہدف اور مقصد کی طرف لے جانے کیلئے معبوث ہوتے ہیں۔

پھر اگر اس سے ذرا اور آگے جائیں تو ایک اور بحث تک جا پہنچیں گے وہ یہ کہ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟

تو پس سوال یہ ہے کہ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے دوسری تمام اشیا اور بالخصوص انسان کی تخلیق میں کیا ہدف پیش نظر تھا!

اس سلسلے میں بات کو یوں واضح کیا جائے کہ ایک مرتبہ جب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ انسان کی خلقت کا مقصد کیا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ خالق کا

خلقت سے کیا مقصد ہے؟ یعنی خالق کی اس تخلیق کا سبب کیا تھا کونسی چیز اس خلقت کی عامل اورمحرک بنی ہے؟ یہ ایسی چیز ہے کہ خلقت کا اس معنی میں (اپنا کوئی) ہدف نہیں ہوگا بلکہ (اصل) ہدف خالق کا ہوگا کیونکہ فرض تو یہ ہے کہ ہدف کا معنی ہےمحرک اور عامل فاعل۔محرک فاعل وہ چیز ہوتی ہے جو اس بات کا موجب بنتی ہے کہ کام کرنے والا ایک کام کوسرانجام دے اگرمحرک نہ ہوتا تو فاعل یہ کام نہ کرتا ہم اس معنی میں خدا کے بارے میں کسی ہدف وغرض کے قائل نہیں ہو سکتے۔یعنی (ہم خدا کے بارے میں یا) فاعل کے بارے میں یہ کہیں گے کہ اس نے یہ کام اس بنا پر کیا ہے کہ وہ اس سے کوئی خاص غرض حاصل کرنا چاہتا تھا وہ غرض و غایت جو فاعل کا محرک ہے وہی باعث بنی ہے کہ جس کے نتیجے میں فاعل اس غرض و غایت تک پہنچنا چاہ رہا تھا یہ چیز فاعل میں (نقص) کی مستلزم ہے اور اس طرح کے اغراض و مقاصدمخلوقات میں اور (بالقوہ فاعل) میں تو صادق آتے ہیں لیکن خالق کے بارے میں صادق نہیں آتے۔

اس طرح کے اغراض و مقاصد سے فاعل اپنے کام کے ذریعے استکمال تک پہنچنا چاہتا ہے یعنی اس کام کے ذریعے وہ ایسی چیز تک پہنچے جو اس کے پاس نہیں ہے لیکن ایک صورت میں خلقت کی جوغرض و غایت ہوتی ہے اس کا تعلق خود فاعل(کام کرنے والے) کی ذات سے نہیں ہوتا بلکہ اس میں فعل کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ جس کام کو انجام دیا جا رہا ہے اس میں کوئی ہدف ومقصد ہے، اس کو کمال کی طرف لے جانا مقصود ہے، وہ خلق ہی اسی کمال کے لیے ہوا ہے، یعنی کمال تک پہنچنا اس خلق شدہ چیز کا کام ہوگا نہ یہ کہ خود فاعل اس کام کے ذریعے کسی کمال تک پہنچنا چاہتا ہے بلکہ اس لیے اس نے یہ عمل سرانجام دیا ہے کہ وہ عمل اپنے کمال کو پہنچے تو اس کا معنی یہ ہوا کہ وہ عمل تکامل و ارتقا کی طرف گامزن ہے، پس اگر ہم اس معنی کو مدنظر رکھتے ہوئے خلقت (یا تخلیق) کو مدنظر رکھیں کہ ہر فعل اپنے وجود کے آغاز سے کمال کی طرف متحرک ہے تو ایسی صورت میں خلقت ایک غرض و غایت کی حامل ہوگی اور ایسا

ہی یعنی ہر وہ چیز وجود میں آتی ہے ایک ایسے انتہائی کمال کی صلاحیت رکھتی ہے (جسے کمال منتزعی کہتے ہیں) اور یہ خلق ہی اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ یعنی ہر چیز کے وجود کا آغاز نقص (زیرو) سے ہے لیکن اس کا رخ کمال کی جانب ہے یا وہ کمال کی طرف گامزن ہے تا کہ وہ اپنے لائق انتہائی کمال تک پہنچے یا ایسے کمال تک جس تک پہنچنا اس کیلئے ممکن ہے۔

یہ مسئلہ کی ''خلقت انسان کی غرض و غایت کیا ہے'' درحقیقت ایک اور سوال کی طرف پلٹتا ہے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے ؟ یعنی انسان کے اندر کون سی استعدادات موجود ہیں اور انسان میں کون سے کمالات ممکن ہیں، ہر ایسا کمال جو انسان کے اندر ممکن ہو اس پر بحث کی جائے، انسان انہی کمالات تک پہنچنے کیلئے خلق ہوا ہے، البتہ چونکہ حکمت کا معنی بھی یہی ہے کہ کسی کام میں کسی خاص غرض و غایت کا ہونا تو اس سے کوئی فرض نہیں پڑتا کہ ہم تک کہہ لیں یا غرض و غایت۔

بنا برایں ضروری نہیں ہے کہ ہم مستقلاً اس عنوان سے بحث کریں کہ انسان کی خلقت کی غرض و غایت اور ہدف کیا ہے بلکہ یہ عنوان ایک اور سوال کی طرف پلٹ آئے گا اور وہ یہ کہ انسان کیسا وجود ہے اور اس کے اندر کون سی استعدادات موجود ہیں، بالفاظ دیگر چونکہ ہم اسلامی حوالے سے بحث کر رہے ہیں نہ کہ عقلی اور فلسفی حوالے سے تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ انسان کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے اور اسلام جس انسان کو جانتا ہے اس میں ایسی کونسی صلاحیتیں موجود ہیں جن کیلئے اسے خلق کیا گیا ہے۔

فطرتاً انبیا کی بعثت بھی انسان کی تکمیل کیلئے تھی، ایک ایسا مفہوم جس پر سب متفق ہیں یہ ہے کہ انبیا انسان کی مدد کیلئے آتے ہیں۔ یعنی درحقیقت انسان کی زندگی میں ایک نقص ہے کہ انسان انفرادی طور پر بلکہ اجتماعی طور پر بھی اپنے جیسے دوسرے افراد کی مدد سے اس نقص کو دور نہیں کرسکتا، فقط وحی ہی ہے جس کی مدد سے کمالات کے

ایک سلسلے کی طرف حرکت کرسکتا ہے۔

پس یہ بات کی انبیا کی بعثت کا ہدف بھی انسان کی تکمیل اور اس کو اس کی تخلیق کی غرض و غایت تک پہنچنا ہے، کلی طور پر یہ بات ایسی متفق علیہ ہے کہ اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ اب یہ کہ انسان کی زندگی کا مقصد انفرادی حوالے سے کیا ہونا چاہیے۔ یہ بھی کلی طور پر ایک ایسا سوال ہے جس پر چنداں بحث کی ضرورت نہیں اور کلی صورت یہ ہے کہ ہمیں کیا ہونا چاہیے؟ ہمارے اندر بالقوہ کونسی استعدادات موجود ہیں جن کو ہم بالفعل بروئے کار لا سکتے ہیں۔ ہماری زندگی کا ہدف بھی یہی ہونا چاہیے لیکن یہاں تک کی بحث تو کلی ہے یعنی ایک عمومی بات ہے۔

ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ خود قرآن نے جزوی طور پر اور مشخص عنوان سے انسان کی تخلیق کے ہدف ومقصد کے بارے میں کوئی بحث کی ہے؟ کیا کہیں اس نے کہا ہے کہ انسان کس لئے خلق ہوا ہے؟ کیا اس نے انبیا کی بعثت کے متعلق بحث کی ہے کہ ان کی بعثت کا ہدف کیا تھا؟ کیا اس نے کہیں کہا ہے کہ انسانوں کو کس کی خاطر زندگی گزارنی چاہیے؟

ہم ایک کلی مفہوم، جو درست بھی ہے کے طور پر کہہ سکتے ہیں کہ انسان سعادت کیلئے خلق کیا گیا ہے۔

انسان کی تخلیق سے خدا کی کوئی (ذاتی) غرض و غایت وابستہ نہیں ہے وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا، اس نے انسان کو اس وجہ سے خلق کیا ہے کہ وہ خود (انسان) سعادت کی منزل تک پہنچے، البتہ انسان وجوداً (اس کے وجود کی تخلیق) اس طرح ہے کہ وہ آزادانہ راہوں کا انتخاب کرے۔ انسان کی ہدایت؟ ''تکلیفی'' ہے (اس کو مکلف اور ذمہ دار بنایا گیا ہے کہ تم پر ذمہ داری ہے کہ یہ یہ کام کرو) اور ''تشریعی'' ہے (اس کیلئے قانون وضع کئے گئے ہیں کہ سعادت تک پہنچنے کیلئے ان قوانین پر عمل کرنا ہوگا)

انسان کی ہدایت تکوینی نہیں ہے (کہ اسے فطری طور پر ہی مجبور کر دیا گیا ہو کہ وہ خود بخود سعادت تک پہنچ جائے) انسان کی ہدایت جبری اور فطری نہیں ہے چونکہ انسان کیلئے راہ کا انتخاب کرنا اختیاری ہے اسی سبب سے راہوں پر چل پڑتا ہے تو کبھی اچھی راہ کا انتخاب کر لیتا ہے اور کبھی بری راہ کا

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳ [1]

یہ بات تو صحیح ہے لیکن قرآن انسان کی سعادت کو کس چیز میں قرار دیتا ہے؟ معمولاً یوں کیا جاتا ہے کہ انسان کی خلقت کا ہدف اور انبیا کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ انسان دو پہلوؤں یعنی "علم" اور "ارادہ" کی قوت کا حامل ہو جائے۔ خدا نے انسان کو علم و آگہی کیلئے خلق کیا ہے اور انسان کا کمال یہ ہے کہ جس قدر ہو سکے علم حاصل کرتا جائے اور دوسرے یہ کہ انسان کو قدرت وتوانائی کیلئے پیدا کیا گیا ہے یعنی جو چاہے اس کو حاصل کر سکے اس کا ارادہ قوی اور مضبوط ہو یعنی جو چاہے اس کو انجام دے سکے۔

گندم کے دانے کی خلقت کا مقصد یہ ہے کہ اس کے اندر ایک صلاحیت موجود ہے کہ وہ گندم کے خوشے کی شکل میں آ سکتا ہے۔ بھیڑ کا کمال یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ چارہ کھائے اور چاق و چوبند ہو جائے لیکن انسان کی استعدادات ان چیزوں سے مافوق ہیں اور وہ ہیں "بداند" وہ "بتواند" یعنی جتنا ممکن ہو علم حاصل کرے اور جتنا ممکن ہو عمل کرے (اسی حساب سے وہ کمال کے درجات تک پہنچتا جائے گا۔ مترجم) انسان اپنی تخلیق کی غرض و غایت کے بہت زیادہ نزدیک ہے۔

بسا اوقات یوں کہا جاتا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد تو سعادت ہے لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جتنا عرصہ بھی اس دنیا میں زندگی گزارے بہتر اور خوش و خرم زندگی گزارے اور فطرت کی دی ہوئی نعمتوں سے جتنا ممکن ہو بہرہ مند ہو، اس دنیا میں دکھ بہت کم اٹھائے، چاہے فطری عوامل کے سبب سے (یہ رنج و عالم ہوں) یا اس

---

[1] سورۂ دھر: ۳

کے ہم نوع دوسرے انسانوں کی طرف سے تو یہیں سعادت ہے۔(سعادت کی اس تعریف کے پیش نظر) اس دنیا میں ہماری تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ جتنا ہو سکے ہم خارجی اشیاء سے اپنی ذات کیلئے استفادہ کریں، یعنی زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہوں اور کم از کم دکھ اٹھائیں کیا انبیاء اسی مقصد کیلئے آئے تھے کہ انسان کی زندگی کو سعادت بخشیں یعنی وہ زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہوں اور کم از کم رنج و الم اٹھائیں ؟ اور (انسانی زندگی کا) کا مقصد و ہدف یہی ہے اور اگر انبیاء نے آخرت کا مسئلہ پیش کیا ہے تو وہ دنیوی زندگی کے نتیجے کے طور پر ہے یعنی انہوں نے بشر کی سعادت کی ایک راہ متعین کی ہے کہ فطرتا اس راہ کی پیروی سے ان کی پاداش یا نتیجہ بھی متعین ہو جاتا ہے اور اس راہ سے انحراف کی صورت میں فطرتاً (یا یوں کہیں کہ خود بخود) اس کی سزا بھی متعین ہو جاتی ہے جس طرح فطرتاً ہر عمل کا ایک نتیجہ(اچھا یا برا) ہوتا ہے اسی طرح آخرت بھی دنیاوی عمل کا ایک فطری نتیجہ ہے تا کہ جو قوانین اس دنیا میں پیش کئے گئے ہیں وہ لغو اور عبث (فضول) نہ رہیں، اس لئے کہ وہ خود(انبیاء) قوت مجریہ(ایسی انتظامیہ جو قوانین کو نافذ کرا سکے) نہیں تھے، لہٰذا وہ دنیا میں لوگوں کو اعمال کی جزا و سزا نہیں دے سکتے تھے، لہٰذا مجبور ایک عالم آخرت بنانا پڑا تا کہ نیکو کاروں کو جزا اور بدکاروں کو سزا دی جا سکے لیکن قرآن میں تو ہمیں اس طرح اور اس نوعیت کی کوئی بات نظر نہیں آتی؟ اب ہم اس کی وضاحت کرتے ہیں۔قرآن ایک جگہ وضاحت کرتا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿٥٦﴾ [1]

ہم نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ (ہماری) عبادت کریں

انسان کی تخلیق اور ایک دوسرے وجود جسے قرآن نے جن کے نام سے ذکر کیا ہے کی خلقت کی غرض و غایت عبادت قرار دی ہے۔

---

[1] سورۂ ذاریات:۵۶

ممکن ہے یہ چیز ہماری سمجھ سے بالاتر ہو کہ آخر یہ کیا ہے؟ یعنی عبادت میں خدا کا کیا فائدہ ہے؟ اس میں اس کا فائدہ تو ہو نہیں سکتا تو اس میں بشر کا کیا فائدہ ہے کہ بشر خلق ہوتا کہ خدا کی عبادت کر سکے؟ لیکن بہر حال قرآن نے اس مفہوم کو بڑی صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے یعنی عبادت کو تخلیق کی غرض و غایت کے طور پر ذکر کیا ہے اور بعض آیات میں قرآن اس نظریئے کے برعکس آخرت کو ایک ''طفیلی'' امر قرار دیتا ہے۔ (خود بخود نتیجہ عمل دنیا) کہتا ہے اگر قیامت نہ ہوتی تو خلقت ہی عبث تھی، یعنی اسے منزلہ غرض و غایت قرار دیا ہے اور اس منطق کی قرآن نے تکرار کی ہے۔

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰکُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ﴿۱۱۵﴾[1]

''کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف پلٹ کے نہیں آؤ گے۔''

عبث اس چیز کو کہتے ہیں جس میں کوئی حقیقی غرض نہ ہو یہ حکمت کے مقابل ہے یعنی تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری خلقت میں کوئی حکمت نہیں ہے؟ یعنی کوئی حکیمانہ غرض نہیں ہے پس تمہاری یہ خلقت فضول اور بے فائدہ ہے؟ اور عطف کے ذریعے یہ بیان کرنا کہ وَّاَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ ''کیا تم ہماری طرف لوٹ کے نہیں آؤ گے'' اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر خدا کی طرف لوٹ کے نہ جانا ہوتا تو خلقت عبث و فضول ہوتی!

قرآن نے کئی ایک آیات میں بار بار مسئلہ قیامت کو خلقت کے برحق ہونے اور باطل نہ ہونے اور تخلیق کے کھیل نہ ہونے اور لغو نہ ہونے (کی دلیل) کے طور پر بیان کیا ہے، درحقیقت استدلال کیا ہے اور قرآن نے جو استدلال پیش کیا ہے (یہ منطقی اصلاح کے مطابق) استدلال لیمی ہے یعنی یہ کہ اس عالم کا کوئی خدا ہے اور یہ خدا

---

[1] سورۂ مومن: ۱۱۵

عبث فعل انجام نہیں دیتا، اس کا ہر کام برحق ہوتا ہے، اس کا فعل باطل یا کھیل نہیں ہوتا، پس اس طرح کی مخلوق کے خلق کرنے والا خالق بھی حکیم ہے۔

ایک دن پروردگار کی طرف پلٹ کے جانا ہے اور درحقیقت یہ قیامت اور خدا کی طرف لوٹ کے جانا ہی سبب ہے جس کے باعث یہ عالم خلق ہوا اور قرآن کی تعبیر بھی اسی بنیاد پر ہے۔قرآن میں کہیں بھی یہ منطق نظر نہیں آتی کہ انسان کی خلقت کا مقصد یہ ہو کہ جتنا ممکن ہو علم سیکھے اور پھر جو کرنا چاہیے کر سکے لہٰذا جب وہ خلقت کے سلسلے میں اس منزل پر پہنچ گیا تو اس نے اپنا ہدف پا لیا بلکہ انسان تو اس لیے خلق ہوا ہے کہ خدا کی عبادت کر سکے اور خدا کی عبادت بذات خود ایک ہدف ہے پس اگر انسان علم حاصل کرتا رہے اور زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے اور پھر جو کچھ چاہے کرتا رہے اور یہاں تک کہ وہ زیادہ سے زیادہ عمل کر سکے لیکن خدا کی معرفت جو عبادت خدا کا مقصد ہے نہ رکھتا ہو تو اس نے خلقت کے ہدف کی طرف ایک قدم بھی بڑھایا اور قرآن کی نظر میں وہ سعادت مند نہیں ہے اور انبیاء بھی اسی وجہ سے مبعوث ہوتے ہیں کہ بشر کو اس کی سعادت و کامیابی (جو ان کی نظر میں خدا ہی کی عبادت تھی) تک پہنچا سکیں۔فطرتاً اسلام کی منطق میں زندگی کا ہدف اصلی سوائے مبعود کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔یعنی قرآن (اک خاص) انسان بنانا چاہتا ہے ۔اسے ایک خاص ہدف و منزل دینا چاہتا ہے، اسلام انسان کو جو ہدف اور منزل دینا چاہتا ہے وہ ہے فقط خدا اور بس ! باقی تمام چیزیں مقدماتی پہلو رکھتی ہیں نہ کہ اصالت و استقلال اور ہدف اصلی۔

وہ آیات جن میں قرآن ایک کامل انسان (کی صفات) بیان کرتا ہے یا جب کامل انسانوں کے بارے میں بات کرتا ہے۔ ان کا تعارف کچھ اس طرح کراتا ہے کہ انہوں نے زندگی کے ہدف کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور اس ہدف پر کاربند ہیں اور اسی ہدف پر آگے بڑھ رہے ہیں ۔مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی قرآن کہتا ہے۔

اِنِّیۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۷۹﴾

''میں نے اپنی جبین اس کے سامنے جھکا دی ہے جس نے زمینوں اور آسمانوں کو خلق کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔''[۱]

قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶۲﴾

''بے شک میری نماز، میرے فرائض، میری زندگی، میری موت اس اللہ کے لیے ہے جو عالمین کا رب ہے''۔[۲]

(اگر آپ غور فرمائیں) تو یہاں توحید قرآن صرف فکری توحید نہیں ہے کہ بس انسان عقیدتی حوالے سے یہ عقیدہ رکھے کہ عالم کو خلق کرنے والا ایک ہے اور خالق عالم ایک ہے بلکہ (اس سے بالاتر) انسان کے اک خاص مرحلے میں بھی ''توحید'' ہو یعنی ایک تو انسان اعتقادی حوالے سے اس بات کا مقصد ہو کہ خالق عالم ایک سے زیادہ نہیں اور دوسری طرف ہدف کے لحاظ سے بھی اس جگہ پہنچے کہ جو ہدف اسے رکھنا چاہیے وہی ہدف اس کے پیش نظر رہے اور بس! اور فطرتاً باقی تمام اہداف اسی ایک ہدف کی پیداوار ہیں (اور اس اصلی ہدف تک پہنچنے کیلئے ہیں، مترجم) یعنی ان میں سے کوئی بھی مستقل حیثیت اور اصالت نہیں رکھتا بلکہ اسی ہدف سے متعلق ہیں پس اسلام میں تمام چیزیں خدا کے گرد گھومتی ہیں، چاہے بعثت انبیا کے ہدف کے نقطہ نظر سے ہوں یا انسان کی انفرادی زندگی کے حوالے سے۔

اب جبکہ قرآن خلقت کا ہدف ''عبادت'' بیان کرتا ہے تو اس کو موضوع تحقیق

---

[۱] سورۂ الانعام:۷۹

[۲] سورۂ الانعام:۱۶۲

قرار دیتے ہیں۔قرآن ایک کامل شخص کے حوالے سے کہتا ہے کہ اس کی زندگی کا ہدف کیا ہوتا ہے؟

قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴿۱۶۲﴾

تو یہاں ''اخلاص'' پیش نظر ہے یعنی ایک مخلص اور مخلص عبد کے وجود پر خدا کے علاوہ کوئی اورسوچ حاکم نہیں ہوتی۔

رہا یہ مسئلہ کہ پیغمبر کیوں آئے؟ اس سلسلے میں قرآن کی گونا گوں تعبیرات ہیں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاہِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیۡرًا﴿۴۵﴾ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذۡنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیۡرًا﴿۴۶﴾

''اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے تجھ کو گواہی دینے والا، بشارت دینے والا، ڈرانے والا اور اس کے اذن کے ساتھ اس کی طرف بلانے والا اور چمکتا ہوا چراغ بنا کر بھیجا ہے۔''[1]

اے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تجھ کو گواہ بنا کر بھیجا ہے(اسی معنی کے اعتبار سے جس طرح قرآن میں آیا ہے) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امت کے اعمال پر گواہ ہیں اورمبشر یعنی اچھے کاموں کی خوشخبری دینے والا کہ جن کی طرف پیغمبروں نے دعوت دی ہے اور نذیر یعنی برے کاموں سے ڈرانے والا اور خدا کی طرف دعوت دینے والا بنایا ہے، اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے تجھے بھیجا ہے کہ اللہ کی طرف دعوت دے اور یہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث کرنے کی غرض و غایت ہے۔

یا دوسری جگہ پر بعض یا تمام پیغمبروں کے بارے میں فرماتا ہے۔

---

[1] سورۂ احزاب:۴۵،۴۶

يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ط [۱]

ایک کامل تعبیر کے اعتبار سے لوگوں کو اندھیروں سے نکال کروا دی نور میں داخل کرنا ہے۔ پس بعض تعبیرات میں کامل طور پر واضح ہے کہ لوگوں کو معرفت خدا کی طرف دعوت دی گئی ہے ۔پس خالق ومخلوق کے درمیان حلقہ اتصال پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

ایک اور آیت میں پوری وضاحت کے ساتھ ایک دوسری چیز کو انبیا علیہم السلام کی بعثت کے ہدف کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے اور وہ ہے عدالت اجتماعی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

''ہم نے اپنے انبیاء کو روشن دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان حق کو نازل کیا تا کہ لوگ عدالت کے ساتھ زندگی گزاریں اور ہم نے لوہے کو نازل کیا کیونکہ اس میں سخت صلابت اور لوگوں کیلئے منافع ہیں۔'' [۲]

یہ آیت بیان کرتی ہے کہ ہم نے اپنے پیغمبروں کو روشن دلائل اور واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجا ہے اور اس کے ساتھ کتاب اور معیار حق (مقصود قانون ہے یا کوئی دوسری چیز) کو نازل کیا ہے تا کہ لوگ عدالت کے ساتھ زندگی گزاریں اور عدالت لوگوں کے درمیان رائج ہو جائے۔

بنا برایں انبیاء کی بعثت جو کہ کارہائے خداوندی میں سے ایک کام ہے ہدف

---

[۱] سورۂ البقرہ:۲۵۷

[۲] سورۂ الحدید:۲۵

اور غرض رکھتی ہے بدون غرض نہیں ہے اور وہ کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے یہ غرض بعثت لوگوں کے درمیان عدالت کو برقرار کرنا ہے پس سارے پیغمبر قیام عدالت کیلئے آئے ہیں، یہاں فلسفہ بعثت تبدیل ہو گیا ہے ہم اس کو دو طریقوں سے فرض کر سکتے ہیں۔

ا۔ اصلی غرض اور لوگوں کے درمیان عدالت کا قیام ہے لیکن عدالت حقیقی لوگوں کے درمیان قائم نہیں ہو سکتی جیسا کہ بوعلی سینا کی طرح کے لوگوں نے اس مطلب پر دلیلیں قائم کی ہیں کہ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ایک عادلانہ نظام لوگوں کے درمیان میں ہو اور عادلانہ نظام کو خود لوگ بنا نہیں سکتے بلکہ خدا کی طرف سے ہو اور انسان اس سے بخوبی واقف ہو کیونکہ انسان تشخیص حقیقت میں قاصر ہے اور خواہشات نفسانی کی پیروی میں مبتلا ہے اور دوسرا قانون کو نافذ نہیں کر سکتا کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ غیر پر اپنی ذات کو مقدم کرتا ہے یا وہ قانون بناتا ہے جو اس کیلئے فائدہ مند ہو اور اس قانون کو چھوڑ دیتا ہے جو اس کو نقصان پہنچائے۔

بنابرایں ایسا قانون ہونا چاہیے جس کے سامنے انسان سر تسلیم خم کر دے، اس قسم کے قانون کو ماسوائے خدا کے کوئی اور نہیں بنا سکتا تا کہ انسان فطرتی طور پر اس قانون کی مخالفت سے ڈرتا رہے، پس عدالت کے قیام کیلئے عادلانہ قانون ضروری ہے اور قانون عادلانہ خدا کی طرف سے ہونا چاہیے، اس کیلئے قانون عادلانہ ضمانت اجرائی بھی رکھتا ہو تو چاہیے کہ جزا و سزا خدا کی طرف سے ہو اور اس کیلئے لوگ اس جزا و سزا پر ایمان قائم کریں چاہیے کہ خود خدا کی معرفت حاصل کریں، پس قیام عدالت کیلئے معرفت و شناخت مقدمہ کے طور پر لازمی قرار پائی۔

پس عبادات کو اس لئے لازم قرار دیا گیا ہے کہ لوگ قانون کے مقنن کو بھلا نہ دیں اور ان کا ارتباط اس کے ساتھ برقرار رہے تا کہ وہ اپنے خدا کو یاد رکھیں کہ وہی خدا ہے جس نے ان کیلئے عادلانہ قانون کو وضع کیا ہے۔

بنابرایں قرآن کی اس آیت مبارکہ سے ثابت ہو گیا کہ بعثت انبیاء کا ہدف

اصلی لوگوں کے درمیان عدالت کا قائم کرنا ہے اور خدا کی طرف دعوت دینا ہدف ثانوی ہے، پس مسئلہ اصلی تو مقنن قانون کی معرفت ہے ورنہ ذات خدا کی طرف دعوت دینے اور معرفت خدا کا کوئی مفہوم نہیں رہتا پس شناخت قانون عادلانہ ہی وہ بنیادی مسئلہ ہے جس پر شناخت خدا اور دعوت بہ خدا کا معاملہ قائم ہے۔

تو اس بنیاد پر فی الواقع تین نظریئے ہمارے سامنے آتے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم کس نظریہ کو اختیار کریں، ایک نظریہ تو وہ ہے جس کو ہم نے بیان کر دیا ہے البتہ اس نظریہ کا قائل کوئی نہیں ہے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ بوعلی سینا جیسے لوگ اس کے قائل ہیں تو وہ بھی سو فیصد اس کی تائید نہیں کرتے، چنانچہ اس نظریہ سے آگے بڑھتے ہیں، ایک نظریہ ہے کہ انبیا کی بعثت کا ہدف لوگوں کے درمیان عدالت کا قیام ہے، حقیقت میں لوگوں کی سعادت مندانہ زندگی اسی دنیا میں ہے اور مسئلہ معرفت خدا اور قیامت پر ایمان رکھنا مقدمہ ہے کیونکہ عدالت کے قیام کیلئے لوگوں کا اپنے خدا کو پہچاننا اور قیامت پر ایمان رکھنا ضروری ہے ، پس خدا کی معرفت اور اس پر ایمان رکھنا عدالت کے قیام کیلئے مقدمہ ہے۔

چنانچہ دوسرا نظریہ پہلے نظریہ کے بالکل برعکس ہے اور وہ یہ ہے کہ معرفت خدا ہدفِ اصلی ہے، عبادت خدا اور تقربِ خدا ہدفِ اصلی ہے اور قیامِ عدالت ہدف ثانوی ہے تا کہ لوگ اس دنیا میں معنویت و روحانیت کو حاصل کریں چاہیے کہ اس دنیا میں زندگی گزاریں، انسانی زندگی کی اجتماعی زندگی کے بغیر چل نہیں سکتی اور اجتماعی زندگی بغیر عدالت کے قائم نہیں ہوسکتی، پس قانون و عدالت مقدمہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اطمینان کے ساتھ عبادت خدا کو انجام دے سکے، اگر ایسا نہ ہوتو عدالت کی کوئی اہمیت نہیں رہتی، بنا برایں آج جو ہم اس قدر مسائل اجتماعی کی اہمیت کے قائل ہیں اور ان کو زیر سایہ عدالت پیش کیا جاتا ہے یہ سب ہدف انبیاء ہیں مگر ہدف اصلی کی بنا پر نہیں بلکہ ہدف ثانوی کے طور پر اور ایک دوسرے ہدف کیلئے مقدمہ کے طور پر ہیں

اور نظریہ سوم یہ ہے کہ کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم بعثت انبیاء کیلئے اور خلقت و زندگی کیلئے کسی ہدف کے قائل ہوں، کسی ایک کو ہدف اصلی کے طور پر اور دوسرے کو ہدف ثانوی کے طور پر قبول کریں ممکن ہے کہ ہم بعثت انبیاء کیلئے دو اہداف کے قائل ہوں اور کہہ دیں کہ پیغمبر مستقل طور پر دونوں اہداف کیلئے مبعوث ہوئے ہیں، کوئی ہدف دوسرے ہدف کیلئے مقدمہ نہیں ہے، ان کی بعثت کا ایک ہدف یہ ہے کہ وہ لوگوں اور خدا کے درمیان ارتباط پیدا کرنے کیلئے آئے ہیں تا کہ لوگ خدا کی عبادت کریں اور دوسرا ہدف یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان عدالت قائم ہو سکے اور کوئی ہدف دوسرے ہدف کے مقدمہ کے طور پر نہ ہو اور دونوں اہداف اصلی ہوں۔

پس قرآن میں دونوں اہداف کو بیان کیا گیا ہے اور دونوں کے اصلی ہونے میں کوئی قباحت نہیں ہے اور کوئی ہدف دوسرے ہدف کا مقدمہ نہیں ہے۔

اس قسم کے نظریہ کی مثال ہم کو بعض دوسرے مسائل میں جن کو قرآن نے بیان کیا ہے واضح طور پر ملتی ہے جبکہ قرآن نے مسئلہ تزکیہ نفس کو بیان کیا ہے تو مسلماً قرآن نے جس مسئلہ کو انتہائی اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے وہ مسئلہ تزکیہ نفس اور تعذیب نفس ہے جس کے متعلق قرآن فرماتا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰

بے شک فلاح ونجات اس شخص کیلئے ہے جس نے نفس کا تزکیہ کر لیا اور ہلاکت اس شخص کیلئے ہے جس نے نفس کو گناہ میں ملوث کیا [1]

چنانچہ قرآن انسان کی کامیابی کو تزکیہ نفس میں پنہاں سمجھتا ہے تو کیا تزکیہ نفس اسلام میں خود ہدف ہے اور کیا انسانی زندگی بعثت انبیاء اور خلقت انسان کیلئے تزکیہ نفس ہدف ہے یا مقدمہ ہے اگر مقدمہ کے طور پر ہے تو مقدمہ کیا ہے؟ آیا معرفت خدا کیلئے

---

[1] سورۂ الشمس: ۹، ۱۰

مقدمہ ہے خدا کی عبادت اور اس کے ساتھ متصل ہونے کا مقدمہ ہے یا عدالت اجتماعی کے قیام کیلئے مقدمہ ہے، انبیاء عدالت اجتماعی کوقائم کرنے کیلئے آئے ہیں اور عدالت اجتماعی قائم نہیں ہوسکتی جب تک انسان ان صفات کو نہ چھوڑے جن کو صفات رذیلہ کہتے ہیں اور ان صفات کو اپنے اندر پیدا نہ کرے جن کو صفات فضیلت کہتے ہیں یعنی وہ صفات جو اجتماعی زندگی کیلئے مناسب نہ ہوں ان کو چھوڑ دے اور ان صفات کو جو اجتماعی زندگی کیلئے مناسب ہوں اپنے اندر پیدا کرے، مثلا صفات رذیلہ یعنی حسد، تکبر، عجب، خود پرستی، ہوا پرستی جو کہ اخلاق اجتماعی کی ضد ہیں ان سے پرہیز کرے اور صفات فضیلت یعنی راست گوئی، امانت، احسان، محبت، تواضع جو کہ اخلاق اجتماعی کا حصہ ہیں اپنے اندر پیدا کرے تا کہ عدالت اجتماعی قائم ہو سکے یا پھر ان سب سے قطع نظر کریں اور کہہ دیں کہ خود تزکیہ نفس ہدف مستقل ہے، تو اب کس نظریہ کو اپنایا جائے۔

ہمارے نزدیک قرآن کسی معنی میں شرک کو قبول نہیں کرتا، قرآن ہر اعتبار سے کتاب توحید ہے توحید بہ ایں کہ خدا کی مثال کا قائل نہیں ہے۔ توحید ذاتی کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ

کسی چیز کو اس کی مثل قرار نہیں دیا جا سکتا[1]

قرآن کتاب توحید ہے۔ ان صفات و اسماء کے عنوان سے جو کہ خدا کے انتہائی کمال کے حامل ہیں۔

لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴿٨﴾ [2]

وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى [3]

---

[1] سورۂ الشوریٰ:۱۱

[2] سورۂ طٰہٰ:۸

[3] سورۂ نحل:۶۰

قرآن کتاب توحید ہے کہ ذات خدا میں کسی کثرت کو قبول نہیں کرتا۔

قرآن کتاب توحید ہے کہ خدا کے علاوہ کائنات کیلئے کسی ہدف کو ہدف اصلی و اساسی مستقل اور نہائی نہیں سمجھتا اور انسان کیلئے خدا کے علاوہ خواہ حرکت تکوینی ہو یا حرکت تکلیفی وتشریعی ہو کسی ہدف کو قبول نہیں کرتا اوراب وہ انسان جونظریہ اسلام کو چاہتا ہے اور وہ انسان جو بشریٰ فلسفی نظریات کو چاہتا ہے دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کو اسلام پیش کرتا ہے اور بہت سے مسائل جن کو دیگر پیش کرتے ہیں ایک جیسے ہیں مگر ایک زاویہ نظر سے نہیں بلکہ اسلام ہمیشہ ان مسائل کو توحیدی اور خدائی نقطہ نظر سے پیش کرتا ہے؟ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے انسان اپنے فلسفی نظریات میں یہاں تک پہنچا ہے کہ کائنات میں ایک غیر متغیر اور محکم سلسلہ قوانین حکم فرما ہے تو قرآن نے بھی اسی مطلب کو بیان کیا ہے مگر تعبیرات میں فرق ہے۔قرآن نے الٰہی نقطہ نظر سے اس کو یوں بیان کیا ہے۔

فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحۡوِيۡلًا ﴿۴۳﴾

ہرگز روش خدا تبدیل نہیں ہوتی اور ہرگز سنت خدا تغیر پذیر نہیں ہے [1]

قرآن اصل عدالت کو قبول کرتا ہے بلکہ فوق العادۃ اس کی اہمیت کا قائل ہے لیکن ہدف نہائی کے عنوان سے نہیں ہے یہ کہ عدالت مقدمہ ہے اس لئے کہ انسان اس دنیا میں پرسکون زندگی گزارے کہ جس کو ہم درک کرتے ہیں بلکہ دنیا کی پرسکون زندگی کو اسلام جس حد تک قبول کرتا ہے اس کو توحید عملی کے سایہ میں دیکھتا ہے یعنی یہ کہ انسان خالصتاً خدا کا ہو جائے اور اسے اس کا مقدمہ سمجھتا ہے اور انسان وہ موجود ہے جس کی سعادت خدا کے ہاتھ میں ہے اور خدا ہی اس کی سعادت کو پورا کرسکتا ہے۔یعنی انسان خدا کا بنایا ہوا ایسا موجود ہے کہ جس کی سعادت کو خدا کی خوشنودی ہی

---

[1] سورۂ فاطر:۴۳

پورا کر سکتی ہے اور سوائے ذات پرورگار کے انسان کو کوئی چیز تکامل عطا نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ارشاد پروردگار ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۝۲۸

وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں ان کے دل یاد خدا سے مطمئن ہوتے ہیں چناچہ دل ذکر خدا ہی سے مطمئن ہوتے ہیں [۱]

یہ عجیب معجزانہ تعبیر ہے کہ وہ جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دل یاد خدا سے مطمئن ہوتے ہیں، اس مقام پر ایک امر اثباتی ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے دل یاد خدا سے مطمئن ہوتے ہیں اور دوسرے انسانوں کے دل دوسری چیزوں سے مطمئن ہوتے ہیں لیکن اس کی نفی کرتا ہے ورنہ یائے تنبیہ لائی جاتی ،خبردار کر رہا ہے اور ایک اہم خبر کا اعلان کر رہا ہے کہ ''بذکر اللہ'' کے لفظ کو مقدم کیا ہے اور ادبا و علمائے نحو کی تعبیر کے مطابق تقديم ماهو حقه التاخير يفيد الحصر یعنی وہ چیز جو حسب قاعدہ موخر ذکر ہونی چاہیے اور وہ مقدم کر دی گئی ہو تو حسب قاعدہ حصر کا فائدہ دیتی ہے جبکہ عربی زبان کے دستور کیمطابق متعلقات فعل جار و مجرور کو فعل کے بعد ذکر ہونا چاہیے، چنانچہ جب اس طرح ذکر ہوا ہے کہ ان کے دل تنہا یاد خدا سے اور غیر خدا کو بھلا دینے سے مطمئن ہوتے ہیں یعنی قلب مضطرب کے اطمینان کو اور اس کی سعادت کو خدا ہی پورا کرسکتا ہے اور باقی تمام چیزیں امر مقدمی ہیں یعنی منازل بشر میں سے ایک منزل ہے نہ کہ انسان انتہائی منزل ہے۔لہٰذا عبادت بھی اسی طرح ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝۱۴

''میری یاد کیلئے نماز کو قائم کرو''۔ [۲]

---

[۱] سورۂ رعد:۲۸

[۲] سورۂ طٰہٰ:۱۴

ہدف ذکر ہے اور آیت

الصَّلٰوۃَ ط اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ط

''نماز بدکاری اور ناروائی سے روکتی ہے'' خصوصیت نماز کو بیان کرتی ہے اور ہدف کو بیان کرتی ہے۔[1]

وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ط

''یاد خدا زیادہ اہم ہے''[2]

اسلام انسان کو عبادت خدا، تقرب پروردگار، مغفرت خلق اور اس کے ذکر کیلئے سمجھتا ہے البتہ اسی مقام سے انسان کیلئے قدرت پیدا ہوجاتی ہے لیکن تمام چیزوں کے بارے علم وقدرت مقدمہ ہیں نہ کہ اصل اور تزکیہ نفس بھی ہدف ثانوی ہے۔ ایک کیلئے ہدف ہے اور دوسرے کیلئے وسیلہ ہے۔

☆☆☆☆☆

---

[1] سورۂ عنکبوت:۴۵

[2] سورۂ عنکبوت:۴۵

دوسری تقریر

انفرادی اور اجتماعی اخلاق کی بنیاد

انسان اپنی زندگی میں خواہ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی غیر مادی سلسلہ اہداف کا محتاج ہے ہم فی الحال انسان کی انفرادی زندگی کے سلسلہ اہداف روحانی اور اہمیت معنوی وغیر مادی کے بارے بحث نہیں کریں گے چونکہ فی الحال مورو بحث نہیں ہے، شاید اجتماعی زندگی کی ابحاث کے ضمن میں واضح ہو جائے لیکن اجتماعی مکتب انسانوں کیلئے مشترکہ اہداف کے ایک سلسلے کی احتیاج رکھتا ہے، چنانچہ اگر مشترک اہداف نہ ہوں تو اجتماعی زندگی اپنے حقیقی مفہوم کے ساتھ یعنی منظم زندگی امکان نہیں رکھتی چونکہ اجتماعی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کا نام ہے اور تعاون اہداف کے اشتراک کے ساتھ ہی ممکن ہوسکتا ہے، اگر ہدف مشترک نہ ہو تو لوگوں کے درمیان تعاون امکان پذیر نہیں ہوسکتا، مشترک ہدف سے مراد مادی ومعنوی ہر دو اہداف ہیں۔

مثلاً ممکن ہے کہ تمام لوگوں کا ہدف مشترک ہدف مادی ہو، جیسا کہ لوگ تجارتی یا صنعتی کمپنیاں بناتے ہیں، سرمایہ دار لوگوں کا ایک گروہ اکٹھا ہو کر تجارتی یا صنعتی کمپنی بنا لیتا ہے یا ایک آدمی سرمایہ دار اور دوسرا بازو دار یا چند بازو دار افراد باہم معاہدہ کر لیتے ہیں کہ کاروبار ایک کرے گا اور سرمایہ دوسرے کا ہو گا اور اس کے بعد مشترک کاروبار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

پس ہدف مشترک عام ہے لیکن معاشرہ انسانی کو ایک ہی شراکت کے

ذریعے منظم نہیں کیا جا سکتا یعنی یہ ممکن نہیں ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی کی بنیاد ایک بڑی شراکت کو بنا دیا جائے۔ البتہ ہمارے نزدیک ایسا ممکن نہیں ہے ورنہ بعض حضرات کے نظریہ کی بنیاد یہی ہے کیونکہ وہ سوائے ذاتی منافع کے اجتماعی اخلاق کی بنیاد کے قائل نہیں ہیں جس طرح کہ رسل کے اخلاق کی بنیاد یہی ہے۔

رسل کا نظریہ ہے کہ اجتماعی اخلاق درحقیقت ایک قسم کا معاہدہ ہے جو لوگ آپس میں قرار دیتے ہیں کیونکہ تمام افراد اچھے طریقے سے جانتے ہیں کہ ان کے منافع کی حفاظت اس میں ہے کہ ایک دوسرے کے حقوق و وجود کی رعایت کریں، اس کی مثال یوں ہے کہ میں کسب طبع خواہش رکھتا ہوں کہ ہمسایہ کی گائے بھی میری ملکیت میں ہو لیکن یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اگر میں نے یہ کام کیا تو ہمسایہ بھی جوابی کارروائی کرتے ہوئے میری گائے لے جائے گا اور دوسرا ہمسایہ بھی اسی طرح کرے گا تو بجائے اس کے کہ میں زیادہ نفع حاصل کروں زیادہ نقصان کا شکار ہو جاؤں گا، پس میں کہتا ہوں کہ مصلحت اس میں ہے کہ میں تیرے حق کو محترم جانوں اور تیری گائے کو تیرا مال سمجھوں تا کہ میری گائے میری ملکیت میں رہے، چنانچہ رسل اخلاق اجتماعی کی بنیاد منافع فردی کی حفاظت میں سمجھتا ہے اور فی الواقع افراد کے حقوق کے احترام کی بنیاد ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کرنے میں ہے کیونکہ وہ مصلحت فرد دوسروں کی رعایت میں سمجھتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ چوروں کے روابط بھی ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح کے ہوتے ہیں ۔ جب کچھ چور ایک دوسرے کے ساتھ پیمان باندھتے ہیں کہ چوری کریں تو وہ اپنے درمیان عدالت سے کام لیتے ہیں اور ایک دوسرے کی رعایت کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ تنہا اس کام کو انجام نہیں دے سکتے یعنی وہ سب ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں۔

ایک دوسرے کے محتاج ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے حقوق کا بھی احترام کرتے ہیں۔ اسی دلیل کی بنا پر ہم نے ہمیشہ کہا ہے کہ رسل کی گفتگو اس کے فلسفہ (یعنی دلیل) سے بہت فرق رکھتی ہے۔ اس کی گفتگو ہمیشہ انسان دوستی پر مبنی ہوتی

ہے لیکن انسان دوستی کی بنیاد کو ہمیشہ رد کیا ہے کیونکہ وہ اخلاق اجتماعی کی بنیاد منافع کو سمجھتا رہا۔ یہ اخلاق اس فرد پر حاکم ہو سکتا ہے جو اپنی منفعت دوسروں کے ساتھ رعایت تعاون میں جانتا ہو اور دوسروں کے ردعمل سے ڈرتا ہو۔ جب ایک گروہ طاقت وتوانائی میں دوسرے گروہ کے برابر ہو تو طبعاً دونوں ایک دوسرے کا لحاظ کرتے ہیں۔ اگر ایک گروہ طاقتور ہو اور پوری طرح مطمئن ہو کہ دوسرا گرہ بالکل مقابلہ نہیں کرسکتا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اصول اخلاق کی رعایت کریں اور کیوں کریں۔ فرض کریں نکسن اور برژنیف جب ایک دوسرے کے مقابلے میں آئیں چونکہ ایک دوسرے کے مقابلے میں برابری کے حامل ہیں تو یہ بات ان کے پیش نظر رہے گی کہ اسی صورت میں نفع حاصل کر سکتے ہیں جب ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت کریں لیکن جب ان میں سے ہر ایک کسی کمزور گروہ کے مقابل آئے تو پھر وہ قطعاً اصول اخلاق کی رعایت نہیں کریں گے۔ اس صورت میں رسل کا امریکہ پر اعتراض کرنا کہ مثلاً تم ویتنام میں کیوں لڑ رہے ہو، یہ کام غیر انسانی کام ہے غیر مناسب اعتراض ہے غیر انسانی کیوں کیا مطلب؟ امریکہ نے کونسا جرم کیا ہے کہ جنگ نہ کرے۔

بہر حال یہ ایک مسلمہ مکتب ہے جو انتہائی کمزور ہے کہ اجازت دیتا ہے کہ طاقتور ضرور اپنی طاقت سے کام لے اور کمزور سے کہتا ہے کہ تو طاقت ور ہوتا کہ طاقتور تجھ پر اپنی زور آزمائی نہ کرے۔ یہ بات درست ہے مگر اخلاق نہیں ہے کیونکہ کمزور قوی تر کو حکم نہیں دے سکتا کہ نہ کرو کیونکہ تمہیں یقین ہے کہ کمزور تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکتا یہ کوئی دلیل نہیں رکھتا کیوں نہ کرے۔ ایسے مکتب فکر میں یہ کام طاقتور کیلئے قطعی طور پر جائز ہے۔

پس کسی دوسری چیز کی تلاش میں نکلیں ۔ممکن ہے کہ ایک مکتب فکر مشترک مادی ہدف کی بنیاد پر تشکیل پائے لیکن مذکورہ مفاسد کے اظہار کیلئے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرلے اور کہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ تجاوز کے اسباب کی تحقیق کریں کہ اگر تم لوگ یہ کہو کہ طاقتور کیلئے کمزور پر تجاوز کی صورت میں کونسی رکاوٹ ہے تو کہا جاتا

ہے کہ ابتداء سے ہی معاشرہ کو اس طرح بنائیں کہ جس میں طاقتور اور کمزور کا سوال ہی پیدا نہ ہو کیونکہ افراد کا قوی وضعیف ہونا کسی بات میں ہے۔ جب ہم اس بنیاد کو خراب کر دیں گے تو معاشرہ کے تمام افراد ایک سطح پر آ جائیں گے تو برابری کی وجہ سے اس وقت طبعاً ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کریں گے۔ اس کی اصلی بنیاد ملکیت ہے کیونکہ تمام سیاسی و اجتماعی طاقتور حکومتیں اسی سے نکلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ملکیت کو درمیان سے نکال دیں تا کہ معاشرہ کے تمام افراد ایک سطح پر آ جائیں اور برابر ہو جائیں تا کہ طبعا ایک دوسرے پر تجاوز نہ کر سکیں۔ اس حال میں تمام افراد مشترک ہدف رکھتے ہیں کہ وہی ان کی مادی زندگی ہے۔ پورا معاشرہ بصورت اشتراک حقیقی سامنے آ جائے گا تو ارکان معاشرہ میں سے کوئی ایک بھی دوسرے پر تجاوز نہ کرے گا چونکہ ملکیت ہی زور آوری اور اس بدبختی کا سبب ہے لہٰذا اسے ہم نے الگ کر دیا ہے۔ چنانچہ مارکسزم اسی قسم کا مکتب ہے ۔مکتب میں مسائل معنوی پر بالکل تکیہ نہیں کیا جاتا وجدان اخلاق نامی قسم کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ تمام شرارتوں، شقاوتوں اور ظلم و تعدی کی وجہ ملکیت ہے۔ جب ملکیت کا قلع قمع کر دیا تو گویا ذریعہ جرم و جنایت کو ختم کر دیا گیا۔ جب ذاتی ملکیت ختم ہو گی اور ملکیت اجتماعی آئے گی۔ یعنی جب ہر فرد نے اپنی استعداد کے مطابق کام کیا اور اپنی ضروریات کو معاشرہ سے پورا کیا تو طبعاً صلح و صفا اور عدالت وا خلاق پر قائم ہو جائے گا اور کینہ ونفرت، عداوت و دشمنی ختم ہو جائے گی اور لوگ بھائی چارے اور برابری کی زندگی گزارنے لگیں گے۔ اس مکتب فکر میں بھی معنویت و روحانیت نامی کوئی چیز نہیں ہے اور معاشرہ کو معنوی قدر و قیمت اور روحانی اقدار کے بغیر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نظریہ بھی ناقص اور نادرست ہے کیونکہ عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معاشرے جن سے ملکیت کو ختم کر دیا گیا ہے ظلم و تعدی و انحراف وتجاوزات سے آزاد نہیں ہو سکے۔

اگر ان کا نظریہ صحیح ہوتا تو معاشرہ جب زندگی اشتراکی تک پہنچ جائے تو فساد و

تجاوز ختم ہو جانا چاہیے تھا جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کمیونسٹ معاشرے تصفیہ و انحراف کے بہانے ایک دوسرے کے گلے پڑتے ہیں تو اس کی علت وسبب یہ ہے کہ امتیازات کا واحد عامل ذاتی ملکیت نہیں ہے اولاً امتیازات صرف پیسوں اور خرید و فروخت کے امتیازات نہیں ہیں، انسان امیتازات کا ایک اور سلسلہ رکھتا ہے کہ جن کی اہمیت کا وہ قائل ہے مثلاً عورتوں میں ایک عورت نسبتاً زیادہ خوبصورت ہے تو یہ زندگی کا ایک امتیاز ہے اگر چہ مسئلہ ملکیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے یعنی اگر ملکیت اشتراکی بھی ہو تو یہ امتیاز اپنے مقام پر امتیاز ہے۔

اور اس سے بڑھ کر اہم اور بالاتر امتیازات صاحب عہدہ اور صاحب مقامات ہونا ہے اور انسان کے نزدیک پست اور صاحب مقام ہونے کی قدرو قیمت پیسوں کی قدرو قیمت سے زیادہ ہے۔ راکفلر جو ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ ریاست جمہوری امریکہ کے انتخابات میں شرکت کرے جبکہ وہ دنیا کا امیر ترین آدمی ہے یا ان چند افراد سے ہے جو دنیا کے امیر ترین انسان ہیں جبکہ اس کے دل میں ریاست جمہوری کی خواہش موجزن ہے اور یہ آرزو فوق العادۃ اس کے دل میں موجود ہے۔ انسان شہرت، ریاست اور افتخار و قدرت کے حصول کیلئے پیسوں اور دولت کو قربان کر دیتا ہے۔ جب لوگ کسی کے سامنے اس کے ڈر کی وجہ سے یا محبوبیت و پیار کی وجہ سے یا ایمان واردات کی وجہ سے جھکتے ہیں تو انسان کیلئے یہ بات فوق العادۃ اہمیت رکھتی ہے۔

مثلاً کیا لوگ آرزو نہیں کرتے کہ آقائی بروجردی کی طرح لوگ ان سے ملنے کی آرزو کریں اور انتہائی خضوع وخشوع کے ساتھ ان کے ہاتھوں کو بوسے دیں اور التماس کرتے ہوئے ان کو واجبات شرعیہ پیش کریں اور جواب سلام پر افتخار کریں، یہ ایک انسان کی اہمیت ہے تو کیا اہمیت پیسوں کے ساتھ حاصل ہوتی ہے؟ یا اس کے مقابلے میں شاہ مملکت (صدر یا وزیر اعظم) ہونے سے کہ ہزاروں، لاکھوں سپاہی اس کے سامنے ادب و احترام پیش کریں تو یہ چیزیں بھی انسان کیلئے بالآخر اہمیت رکھتی ہیں اگر اہمیت نہ ہوتی تو اس قسم کے افراد کا احترام نہ کیا جاتا۔ ان مسائل کو حقیر اور کم تر نہ

سمجھیں۔

بنابرایں ایک دوسرے کے حقوق پر تجاوز کی بنیاد صرف مال و دولت نہیں ہے اور دوسری چیزیں بھی قابل اشتراک نہیں ہیں کہ ان کو اشتراکی کہا جائے۔

ثانیاً جب دوسرے وسائل کے ساتھ دوسرے امتیازات کو حاصل کیا جائے گا تو اس معاشرے میں جو کہ ہدف مشترک رکھتا ہے صاحبان معاشرہ کیلئے مال و دولت کے ذریعے حاصل ہونیوالا امتیاز مسلم امتیاز ہو گا، فرض کریں کہ کیا روس میں ایک با ثروت خروشچیف ایک دھقان کے برابر ہے؟ اگرچہ وہ دھقانوں کے گروہ کا نمائندہ ہی کیوں نہ ہو۔ آخر کار دھقان کو اپنی پوری زندگی میں ایک بار بھی ایسا اتفاق نہ ہو گا کہ وہ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اس شہر سے اس شہر تک جائے لیکن ثروت مند بہترین قسم کے ہوائی جہاز اختیار میں رکھتا ہے کبھی ادھر جاتا ہے کبھی ادھر آتا ہے۔

پس اس طرح نہیں ہے کہ امتیاز صرف مال و دولت کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔(امتیاز مال و دولت ہی دنیا میں امتیاز مسلم شمار ہو) کہ مال و دولت کی شراکیت کے ساتھ حل ہو جائے اور اشتراکیت دولت کیساتھ لوگ جہاں مجھی ہوں ثروت اشتراکی سے فائدہ اٹھائیں۔ ہرگز ایسا نہیں ہے۔

جس طرح کہ ہماری حکومت کارندہ ہے جبکہ مال و دولت عمومی ہے کسی فرد و شخص کا مال نہیں ہے اور یہ مال عمومی کہ جس پر بالکل عنوان فردی و اختصاصی کا اطلاق نہیں ہوتا تو کیا سب لوگ ایک ہی طرح کا اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔مثلاً ایک آدمی کسی ادارے میں کسی اعلیٰ عہدہ پر کام کرتا ہو مثلا ادارے کا سربراہ ہو یا اعلیٰ ترین مقام رکھنے والوں سے رابطہ رکھتا ہو تو مختلف عناوین سے مال حکومتی سے استفادہ کرتا ہے۔ مسافرت وغیرہ میں جبکہ مال حکومتی ہر شخص کی ملکیت ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں مطلب خالی ازا اہمیت نہیں ہے بلکہ مہم تر ہے کہ اسی معاشرہ اشتراکی میں اپنے حقوق سے درگزر کر دینا اپنے آپ کو فدا کاری کیلئے پیش کرنا یا مادی تحائف سے صرف نظر کرنا بھی امتیازات میں داخل ہیں، مثلاً ایک سپاہی ہے اس کو

چاہیے کہ میدان میں جائے اور جنگ کرے اور مارا جائے تو اب منافع مشترک کی بنیاد پر مارا نہ جائے گا کیونکہ اس بنیاد پر مارا جانا معنی نہیں رکھتا، اس پر احساسات حاکم ہوں تب وہ اپنے آپ کو مارے جانے کیلئے حاضر کرے گا، اسی مطلب پر آ کر وہ مکتب فکر بھی جو مادی ترین مکتب فکر ہیں اس قسم کی ارزش معنویت سے بے نیاز نہیں سمجھتے، اگرچہ اپنے مطلب کو بعنوان معبود ایک با ارزش چیز تصور کریں، یہ خود ایک معنویت ہے۔

بلاشک وتردید وہ مکتب جس کی بنیاد مادی منافع کی اشتراکیت اور اور ان کی حفاظت ہوتو وہ مکتب ایک جامع مکتب فکر نہیں بن سکتا۔ اصلاً ایک مکتب عملی بن ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا یہی مادہ پرست ایک سلسلہ معنویت کے قائل ہیں۔ جبکہ ان ہی مادی کمیونسٹ حکمرانوں کا طرز عمل مکتب کے ساتھ یا شعار ملکی کے ساتھ کیسا ہے؟ اور کس طرح ان کا مظاہرہ کرتے ہیں؟ ہمیشہ اس طرح عمل کرتے ہیں کہ مسلک تمام چیزوں سے بالاتر دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ اس بنیاد پر مسلک کوئی چیز نہیں ہے بلکہ منافع زندگی تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مادی مکتب فکر کی بنیاد پر مسلک ایک ایسا نقشہ ہے کہ جیسے انجینئر ایک عمارت بنانے کے لیے تیار کرتا ہے عمارت کا نقشہ عمارت کے مقابلے میں کوئی تقدس نہیں رکھتا بلکہ عمارت بنانے کا ایک وسیلہ ہے۔ عمارت کے مقابلے میں ایک بہترین نقشہ کہ جس کی بنیاد پر عمارت تعمیر کی جاتی ہے، فرع ہے اور عمارت اصل ہے۔ عمارت کبھی بھی نقشہ پر قربان نہیں ہونی چاہیے بلکہ نقشہ عمارت کے لیے ہے۔ حد اکثر یہ مسلک معاشرتی تعمیر کا بہترین نقشہ ہے۔ یہ نقشہ میرے لیے معبود کی حیثیت کیوں اختیار کرے جبکہ نقشہ عمارت کے لیے اور عمارت میرے لیے ہے تو کیا میں اس نقشہ کے لیے قربان ہو جاؤں؟ اس نظریہ کا کوئی معنی نہیں ہے۔

لیکن مسلک کو تعمیر معاشرہ کے لیے بطور وسیلہ یا زندگی افراد کے لیے بطور وسیلہ نہیں دیکھا جاتا بلکہ مسلک کو اس کی قدامت و بزرگی کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کو بے بنیاد سمجھیں لیکن ان کے لیے کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو

اور دوسروں کو اس کی تلقین کریں۔

بنابرایں کوئی معاشرہ ایسا نہیں ہے جو ایک سلسلہ اہداف معنوی یا آج کے علماء کی تعبیر کے مطابق ارزشہائے معنوی سے بے نیاز ہو۔ اب دیکھا جائے کہ یہ ارزشہائے معنوی کیا ہیں۔

آیا حقیقت بھی ہے یا سادہ لوح انسانوں کو دھوکا دینا ہے۔ جس طرح کہ وطن وملت کے بارے لوگ خرافات سے کام لیتے ہیں اور یہ سادہ لوح انسانوں کو دھوکا دینا ہوتا ہے بلکہ چاہیے کہ انسان مذہبی ارزشہائے معنوی کا اس طرح قائل ہو کہ مادی منافع کو اس کے مقابلے میں بے معنی چیز سمجھنے لگ جائے۔

اس مطلب سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہدف معنوی یا ارزش معنوی کا مطلب کیا ہے۔ ارزش کا اصلاً مفہوم کیا ہے۔ انسان ارادی طور پر ہر کام کو انجام دیتا ہے اور اس کا ہر اختیاری کام ایک ہدف کی خاطر ہے اور وہ ہر اس ہدف کا پیچھا کرتا ہے جس کی اہمیت کا قائل ہوتا ہے۔ اب وہ خواہ مادی ہو یا معنوی، یعنی اس ہدف کے لیے انسان کی طبیعت میں جاذبہ ہے وگرنہ محال ہے کہ ایک چیز جاذبیت نہ رکھتی ہو اور انسان اس کی تلاش میں سرگردان رہے اس قسم کی چیز امکان نہیں رکھتی اور یہ محال ہے۔ کہا گیا کہ عبث مطلق اور لغو و بیہودہ مطلق کام انسان سے انجام پذیر ہونا محال ہے۔

ہر وہ کام جس کو ہم عبث کہتے ہیں تو وہ مبدائے فکری اور مبدائے عقلی میں عبث ہے۔ وگرنہ دوسرے مبدا کے اعتبار سے کہ کام اس سے صادر ہوتا ہے عبث نہیں ہے۔ مثلاً قوۃ خیال محرک ہے اور کسی ہدف تک پہنچ جاتی ہے۔ قوۃ خیال اپنے ہدف تک پہنچ جاتی ہے مگر قوۃ عاقلہ کسی ہدف تک نہیں پہنچتی۔ مادی امور میں یہ بات قابل بحث نہیں ہے کہ وہ چیز جو میرے لیے اور میری زندگی کے لیے مفید ہے اور مدد کرتی ہے چونکہ میں ذاتی طور پر اپنی زندگی کو پسند کرتا ہوں اور اس سے میرا عزیزی وجنسی تعلق ہے۔ طبعی طور پر میں اس کی طرف کھنچ جاؤں گا اور وہ میرے لیے اہمیت رکھتی ہے۔

اگرچہ مادیات میں اصطلاح ارزشی کو نہیں لایا جاتا ہے لیکن اہمیت عمومی کے

اعتبار سے مادیات میں بھی استعمال ہوتی ہے چنانچہ ایک ڈاکٹر میرے لئے اہمیت رکھتا ہے کیونکہ مجھ سے بیماریوں کو دور کرتا ہے، دوا میرے لئے اہمیت رکھتی ہے اور غذا جو کہ میرے بدن میں حل ہو کر مجھے غذائیت بخشتی ہے میرے لیے اہمیت رکھتی ہے۔

اس کے بعد امور معنوی سامنے آتے ہیں جن کا کوئی مادی بدل نہیں، ان کا مطلب کیا ہے، چنانچہ امور مادی یعنی جو جسم سے متعلق ہیں اور جسم کے کام آتے ہیں یا تو وہ خود جسم ہیں جیسے غذا ہے یا خود جسم نہیں ہیں بلکہ ہمارے جسم کی اصلاح اس کے ساتھ وابستہ ہے جیسے ورزش چونکہ انسان اپنے جسم کی سلامتی کو اہمیت دیتا ہے اور ورزش اس کے جسم کی سلامتی کا سبب ہے۔ اس کے لئے اہمیت رکھتی ہے، فرض کرتے ہیں کہ کسی سے نیکی کرنا منفعت مادی نہیں رکھتا اور بطور کلی معاشرہ کی خدمت اور آئندہ نسل کی خدمت ہے۔ ان کا مفہوم ایک ہے، تو انسان ایک فرہنگی ادارے میں اس نظریہ کے ماتحت فوق العادہ کوشش کرتا ہے کہ وہ آئندہ نسل کی خدمت کر رہا ہے اور اسکی اپنی ذات کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے نقصان ہے کیونکہ اس کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ اس کا کام رکتا ہے اور اپنی کمائی میں جو کمی آتی ہے اس کو کسی طرح پورا کیا جائے۔

معنویات کا مسئلہ انسانی زندگی میں اہم مسئلہ ہے اور یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آیا امور معنوی پر ایمان خدا پر ایمان کے ساتھ وابستہ ہے یعنی خدا پر ایمان تمام معنویات پر ایمان رکھنے کی بنیاد ہے خدا پر ایمان نہ بھی ہو اور عملاً ارزش ہائے معنوی کا ایک سلسلہ انسانی زندگی میں حکم فرما ہوسکتا ہے۔

کتاب 'اصالت بشر' میں ایک جملہ ہے جو ایک مشہور روسی مصنف داستایوسکی کی تحریر ہے وہ کہتا ہے اگر واجب الوجود نہ ہوتو تمام چیزیں مجاز ہیں یعنی ہم جو کاموں کو اچھے اور برے میں تقسیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کام کو کرنا چاہیے اور اس کو نہیں کرنا چاہیے اور جنبہ ہائے معنوی کے حوالے سے مثلاً سچ بولنا چاہیے اور جھوٹ نہیں بولنا چاہیے، معاشرے کے ساتھ خیانت نہیں کرنی چاہیے بلکہ خدمت کرنی چاہیے، وہ کہتا ہے کہ یہ تمام چیزیں خدا اور واجب الوجود پر اعتماد کے تابع ہیں اگر واجب الوجود

کائنات میں نہ ہوتو تمام چیزیں مجاز ہیں یعنی تمام چیزیں مباح ہیں ہاں۔ نہ۔ چاہیے نہ چاہیے بطور کلی ختم ہو جاتے ہیں۔ آیا اس طرح ہے نہیں۔ مارکسٹوں کے کام میں ایک خوبی ہے چونکہ وہ مادیت پرست ہیں۔ مسائل معنوی کے پیچھے نہیں جاتے اور مسائل معنوی کا نام بھی نہیں لیتے کبھی انسانیت کا نام نہیں لیتے بلکہ اگر انسانیت سالم کہہ دیں تو ان کا مقصود بلا امتیاز معاشرہ ہے کیونکہ انسان ان کے نزدیک یا سالم ہوتا ہے یا عیب دار۔ انسان ملکیت کی خاطر اور طبقاتی تفاوت کی وجہ سے فاسد ہو جاتے ہیں۔ اگر اس طبقاتی تفاوت اور ملکیت کو ختم کر دیا جائے تو تمام انسان اپنی پہلی حالت پر برقرار ہو جائیں گے کوئی کسی دوسرے کے کمال کا قائل نہیں ہے اور معنویات میں انسان کی ترقی و تکامل کو نہیں سمجھتے ہیں اور انسان کیلئے کافی ہے کہ وہ ملکیت کی وجہ سے فاسد نہ ہو جائے اور دولت پرست و دولت زدہ نہ ہو جائے لیکن وہ مکتب فکر جو ابھی پیدا ہوئے ہیں کہ ایک طرف سے مادی مسلک ہیں اور دوسری طرف اپنے مکتب کو مکتب انسانیت کا نام دیتے ہیں جیسے سارتر وغیرہ ہے کہ اپنے نظریہ کو ارزشہائے معنوی پر استوار کرتا ہے اور مسئلہ مسئولیت پر اعتماد کرتا ہے۔ کس طرح۔ ایک طرف تو انسان کے آزاد ہونے کے معتقد ہیں یعنی کوئی چیز بھی خواہ الٰہی ہو یا طبعی ہو انسان پر حاکم نہیں ہے۔ اور انسان کا ارادہ کسی صورت میں گزشتہ سے وابستہ نہیں ہے۔ پس یہ انسان اپنے آپ کو خود بناتا ہے نہ کہ ماحول و سرنوشت یا خدا۔ بنابرایں انسان خود اپنا ذمہ دار ہے تو چونکہ ہر کام کو اچھا کام سمجھ کر انجام دیتا ہے۔ بات بھی صحیح ہے یہاں تک کہ انسان جب کسی برے کام کو انجام دیتا ہے تو جب تک اس کو اپنے وجدان میں اچھا نہ سمجھے گا انجام نہیں دے گا اگرچہ ایک ہی لحاظ سے ہو اپنے وجدان میں اس کے ہونے کو درست کہے گا۔

بنابراین کہتے ہیں کہ انسان ہر کام کیلئے اختیار و انتخاب کرتا ہے۔ بقول طلاب دلالت التزامی کے ذریعے سمجھاتا ہے کہ کام اچھا ہے۔ جب بھی میں کام کو کرتا ہوں تو زبان بے زبانی سے معاشرہ کو سمجھا دیتا ہوں کہ یہ میرا کام اچھا ہے۔ لہٰذا ایسے کاموں کو کرنا چاہیے اور آپ لوگ بھی ایسے کام کریں اور کہتے ہیں کہ ہر جزئی کام بھی اپنے اندر

کلیت رکھتا ہے یعنی ہر وہ کام جس کو انسان انفرادی طور پر انجام دیتا ہے تو چاہتا ہے کہ معاشرہ کہ یہ بتلائے کہ ایسے کام کیا کریں اور طبعاً معاشرہ تیار ہو جاتا ہے کہ ایسا کام کرے یعنی ہر کوئی اپنے کام میں دوسرے کیلئے فرد اول قرار دیتا ہے۔ پس انسان اپنا اور دوسروں کا مسئول بن جاتا ہے کیونکہ اپنے کام کو اہمیت دیتا ہے اور اس کو اچھا سمجھتا ہے۔ اس وجہ سے اس کام کے انجام دینے کی طرف دوسروں کو دعوت دیتا ہے۔ اس وجہ سے اس کام کے انجام دینے کی طرف دوسروں کو دعوت دیتا ہے۔ اس مقام پر مسئلہ مسئولیت کو سامنے لایا جاتا ہے کہ ہر فرد کائنات میں اپنا اور دوسروں کا مسئول ہے۔ اب پوچھیں گے کہ یہ مسئول کیا ہے؟ اور اس کے معنی کیا ہیں؟ مسئولیت ایک امر مادی نہیں ہے۔ ایک امر معنوی بمعنی غیر مادی ہے البتہ جائے سوال ہے اور اس کا جواب دیا جانا چاہیے تو مورو سوال کون واقع ہوگا۔ البتہ مادی نظریہ میں اس کا جواب دیا جانا چاہیے۔ حد اقل یہ ہے کہ کہیں انسان وجدان رکھتا ہے کہ اس کو مورد سوال قرار دیتا ہے جیسے نفس لوامہ کہ منطق میں دین آتا ہے اور حقیقت میں اس طرح ہے کہ انسان کی دو شخصیتیں ہیں۔ ایک حیوانی شخصیت اور دوسری انسانی وملکوتی شخصیت تو جب انسان کوئی برا کام کرتا ہے تو یہ شخصیت اس شخصیت اول کو مورد عتاب قرار دیتی ہے اور وہ اس وجدانی کیفیت کے منکر ہیں۔ تو جب اس قسم کی چیز نہ ہو تو مسئولیت کی بنیاد کیا ہے۔

بنیاد مسئولیت سے صرف نظر کرتے ہوئے اگر اس کو ثابت نہ بھی کر سکیں تو بھی اس کے قائل ضرور ہیں جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ مسئولیت ایک امر معنوی ہے۔ میں لوگوں کے سامنے مسئول ہوں۔ میں نسل آئندہ کے سامنے مسئول ہوں۔ اس کے کیا معنی ہیں۔ وہ لوگ جن کا نظریہ مادی نظریہ ہے اور باوجود اس کے وہ چاہتے ہیں کہ انسانیت ومعنویت کو اپنائیں اور انسان کو اس معنویت کا تابع بنائیں۔ درعین حال نظریہ الٰہی کے ساتھ اس قسم کی سوچ رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مکتب میں کہتا ہے کہ اگر نظریہ الٰہی کو مانا جائے تو تمام معنویت ختم ہو جائے گی چونکہ ان سب کی بنیاد انسان کی آزادی ہے۔ اگر خدا ہو تو آزادی کا کوئی معنی نہیں رہتا اور آزادی کے بغیر

انتخاب کا کوئی معنی نہیں ہے اور نتیجہ کے طور پر مسئولیت کا کوئی معنی نہ رہے گا بلکہ اس دلیل کے ساتھ کہ خدا نہیں ہے اور انسان آزاد ہے لہٰذا انسان کی مسئولیت موجود رہے گی پس جبکہ ان کا مکتب مادی مکتب ہے۔ چاہتے ہیں کہ ایک قسم کی معنویت مسلکی نہ کہ فلسفی کے معتقد رہیں تو کیا اس قسم کی کوئی چیز ممکن ہے۔ ممکن ہے کوئی کہہ دے کہ کیا ہو گا اگر ہم خدا کے قائل نہ ہوں۔ لیکن ایک قسم کی معنویت کے قائل ہوں کیونکہ اس معنویت کی بنیاد انسان کے وجدان میں آ گئی ہے۔ اب اس کا سبب کوئی باہمی ٹکراؤ ہو یا کوئی دوسری چیز۔ بالآخر وجود انسان ہے اگر چہ خدائی نہیں ہے مگر یہ معنویت انسان میں ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے کہ انسان جو کچھ ہے ایسے وجدان وفطرت کے ساتھ خلق ہوا ہے کہ اچھے کاموں سے لذت حاصل کرتا ہے اور برے کاموں سے نفرت کرتا ہے اور اچھے کام کو کسی منفعت مادی کی بنیاد پر انجام نہیں دیتا بلکہ اسی وجہ سے انجام دیتا ہے کہ اچھے کام کے انجام دینے سے لذت حاصل کرتا ہے۔ بنا براین انسانی لذات مادی لذات میں محدود نہیں ہیں بلکہ انسان معنوی لذت بھی رکھتا ہے۔ جس طرح کہ علم سے لذت حاصل کرتا ہے حالانکہ علم سے کوئی مادی مفاد حاصل نہیں ہوتا یا تاریخ کا مطالعہ اور عالم گزشتہ کے حالات کی اطلاع یا جغرافیائی حدود کے بارے اطلاع دریاؤں اور ان کی گہرائی کے بارے مطالعہ جبکہ پوری طرح سے جانتا ہے کہ اس کی اطلاعات اس مقام پر کوئی مفاد نہیں رکھتیں اور ایک پیسہ بھی ان کی قیمت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس آگہی سے ایک لذت حاصل کرتا ہے اور نیز اس طرح خلق کیا گیا ہے کہ اخلاقیات سے لذت کیلئے کام کرتا ہے خواہ وہ لذت مادی ہو یا منفعت حاصل نہ کرے۔ چونکہ انسان لذت کیلئے کام کرتا ہے خواہ وہ لذت مادی ہو یا معنوی۔ اپیکوس جو کہ پرانے یونانی فلسفہ میں سے ہے لذت کا طرفدار ہے۔ اصالت لذت۔ البتہ مشہور ومعروف تعبیر اس کے مکتب سے یہی کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ اس بات کا قائل تھا کہ جو دم ملے وہی غنیمت ہے خیام بھی اس کا قائل ہے مقصود اس سے ظاہری خوشی ہے جو کہ کھانے پینے اور دوسری لذات دنیا کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا

لاابالی گری جو کہ بعد میں اپیکورزم کے نام سے معروف ہوا ہے لیکن کہتے ہیں کہ اس کا مکتب حقیقی یہ نہ تھا۔ لذت کو لذات حیوانی میں محدود نہیں کرتا بلکہ معتقد ہے کہ انسان کیلئے ایک معنوی لذات کا سلسلہ بھی وجود رکھتا ہے اور معتقد ہے کہ لذات معنوی مادی لذات سے آسان ترین اور رنج و غم سے بری ہیں۔ کون سا مانع ہے کہ ہم وجدان انسانی کی بنیاد پر جو کہ اچھے کاموں سے لذت حاصل کرتا ہے اگرچہ خدا درمیان میں نہ ہو معنویت کو برقرار کریں۔ مثلاً انسان خوبصورتی سے لذت حاصل کرتا ہے۔ بغیر اس کے کہ کوئی منفعت دنیوی رکھتا ہو کہ اس کے جسم کیلئے مفید ہو یا انسان کے گھر میں گلکاری ہو اور اس کو دیکھ کر لذت حاصل کرے اس کے لئے اہمیت رکھتا ہے جبکہ یہ نہ خود مادہ ہے لیکن روح انسان کیلئے مفید ہے۔ بالآخر انسان سے ایک قسم کی لذت حاصل کرتا ہے یا ایک خوبصورت پرندہ جس کی آواز خوبصورت ہو اور وہ باغ میں آواز نکالے تو انسان کیلئے اہمیت رکھتا ہے اور وہ اس سے لذت محسوس کرتا ہے جبکہ نہ وہ مادہ ہے کہ اس تک پہنچ جائے اور نہ ہی انسان کا جسم اس سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن روح و روان انسان اس سے لذت کا احساس کرتا ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے مگر وہ نقص رکھتی ہے۔ ایک یہ ہے کہ انسان میں وجدان اس قدر قوی نہیں ہے کہ اس کی بنا پر کسی مکتب کو قائم کرے۔ اس طریقے پر تربیت میں انسان کے عمومی منافع کو اس پر قربان کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ انسان ان لذات معنوی کیلئے اپنے آپ کو قتل کر دے۔ اس طرح نہیں ہے۔ اصولاً اگر انسان بخاطر لذت اگرچہ وہ لذت معنوی کیوں نہ ہو کوئی کام کرے یہاں تک کہ اس کے لئے قتل ہو جائے یا زندان چلا جائے البتہ یہ امور بطور تفنن درست ہیں مگر وہ ضروریات انسان جو کہ ایک مکتب میں لازمی ہیں کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے تاکہ لوگ اس مکتب کے ان ارزش ہائے معنوی کی وجہ سے پابند ہو جائیں اور اس مکتب کی پاک بازی اور سربازی کرنے لگ جائیں۔ چنانچہ دنیا میں کوئی شخص تیار نہیں ہے کہ صرف ہونے کی بنیاد پر یا گلہائے خانہ کیلئے قتل ہو جائے کیونکہ پھول کو استفادہ لذت کیلئے پسند کرسکتا ہے مگر اس کے برعکس نہیں ہے۔ مثلاً مدد

کرنے کی صورت میں اگر اس طرح فکر کرے کہ مدد کے وقت لذت حاصل کرتا ہے اور لذت کی خاطر اس کام کو کرتا ہے اور اخلاق کا پابند بھی اسی قدر ہوتا ہے ورنہ اس قسم کی لذت کیلئے ہرگز قتل نہیں ہوتا کیونکہ اس کا کوئی معنی نہیں ہے۔ پس درست ہے کہ انسان اپنے وجدان کی گہرائی میں اچھے کاموں سے عمومی لذت حاصل کرتا ہے اور قرآن بھی اس وجدان کو قبول کرتا ہے مگر اس قدر وجدان ایک مکتب کی بنیاد بننے کیلئے کافی نہیں ہے ۔یعنی ایک مکتب کی احتیاج معنویات پر ایمان ایک حد تک بالاتر ہے۔ لہٰذا اگر کوئی کہے کہ امام حسینؑ کربلا آئے، خود قتل ہوئے، جوان شہید ہوئے اور ان کے اہل بیت قیدی ہوئے کیونکہ ان کا وجدان خدمت خلق خدا سے لذت محسوس کرتا ہے یہ درست نہیں ہے اور پاک یافتگی سے مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ لذت آخر میں خود انسان کی طرف پلٹتی ہے۔

ثانیاً: اگر عالم میں خدا نہ ہو اور نظام بھی نظام ہدفی نہ ہو اور اگر چیزوں اور انسانوں کے درمیان ایک قسم کی وابستگی نہ ہو تو خود لذت کا حاصل کرنا کہ جس کی بنیاد پر ہم خلق ہوئے ہیں تو کیا نہیں کہنا چاہیے کہ غلطی طبیعت میں ہے لذت میں ہم میں ہے مگر ایک اشتباہ ہے اس لیے کہ ہر لذت مادی لذات میں ہے۔ اس احتیاج کی خاطر ہے جو کہ طبیعت میں ہے۔ شوپنہاور کہتا ہے طبیعت افراد نے انسان کو اس لیے کہ دھوکا دے اور اپنے مقاصد کے پیچھے بھیجے بہت سی لذات کو وجدان بشر میں ودیعت کر دیا ہے اس وجہ سے اس کو دھوکا دیا اور اپنے مقاصد کے پیچھے بھیجا ہے۔ مثلاً طبیعت کا ہدف یہ ہے کہ وہ چاہتی ہے کہ نسل باقی رہ جائے۔ اب اگر انسان کو حکم دے کر بقائے نسل کیلئے تو شادی کر، تکلیف اٹھا اور عورت اور بچے کو خوراک مہیا کر۔ عقل مند انسان اس طرح نہیں کرے گا لیکن انسان کو دھوکا دینے کیلئے اور اپنے اہداف کے پیچھے بھیجنے کیلئے اس لذت کو انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے تا کہ انسان خود رغبت و محبت سے اور اختیار و کمال سے شادی کرے۔ بہر حال ہر لذت ایک احتیاج کی بنیاد ہے۔ اگر ایک غذا کے کھانے سے لذت حاصل کرتے ہیں تو اس وجہ سے ہے کہ ہماری

طبیعت اس مادہ کی محتاج ہے۔ اگر لذت حاصل نہ کریں تو نہیں کھائیں گے اور پانی پینے سے لذت حاصل کرتے ہیں اس لئے کہ ہماری طبیعت احتیاج رکھتی ہے۔ نیند سے لذت حاصل کرتے ہیں اس لئے کہ احتیاج ہے یعنی ہر لذت ایک احتیاج واقعی کی بنیاد پر ہے۔ جس طرح ہر درد ایک سبب کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ مادی لذات کا فلسفہ واضح و روشن ہے۔ طبیعت میں حکیمانہ انداز کار ہیں۔ لیکن معنوی لذات کس طرح تو میں اگر کسی یتیم بچے کے کھانا کھانے سے لذت حاصل کروں تو اس کا مجھ سے کیا تعلق ہے۔ اس کو لذت آنی چاہیے میں کیوں لذت حاصل کروں۔ اس صورت میں لذت ایک لغو چیز ہے یعنی حکمت و علت میرے وجود میں نہیں ہے بغیر دلیل کے ہے لیکن اگر کہیں کہ نظام عالم میں ایک نوع کی ہم بستگی ہے اور خلقت حکمت کی بنیاد پر کام کرتی ہے۔ میرے اور باقی افراد کے درمیان متن خلقت میں ایک وابستگی ہے اور سب ایک پیکر کے اعضا ہیں۔ اس وقت جب میں اس لذت کو حاصل کروں گا تو اپنی طرف سے بدون غرض و ہدف اس کے پیچھے نہیں جاؤں گا۔ میری خلقت میں جو ایک جبلت یقینی ہے اس کے پیچھے جاتا ہوں لیکن اگر یہ لذت اتفاقیہ لذت ہو اور اتفاقاً میں اس طرح بنایا گیا ہوں کہ دوسروں کی بھلائی سے لذت حاصل کروں گو کہ یہ لذت میرے لیے کوئی حکمت نہیں رکھتی، اس صورت میں بھی کام آخر کار بغیر ہدف کے ہو جائے گا۔ یعنی طبیعت اپنے کام کا کوئی ہدف نہیں رکھتی اور ایک لغو و بیہودہ کام انجام دیا ہے اور میں طبیعت کے لغو کام کے پیچھے جا رہا ہوں اور اپنے آپ کو قربان کر رہا ہوں۔ مثال کے طور پر اگر ایک سپاہی ہوں اور لوگوں کے دفاع میں ایک لذت حاصل کرتا ہوں تو خود لذت کیا ہے، نہیں جانتا ہوں مگر اس طرح بنایا گیا ہوں۔ مثلاً کبھی کوئی انسان چھ انگلیوں والا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں طبیعت ایک بے ہدف کام انجام دے گی اور تیرا کام بھی بلاغرض ہو اور یہ ارزش و ہدف بھی شمار نہ ہو گا۔ وہ چیز جس میں میرا ہدف ہے اور اس احساس لذت پر ہے جس کو غلطی کے طور پر مجھ میں رکھ دیا گیا ہے اور خود بغیر ہدف کے ہے۔ میری زندگی کو لغویت سے خارج نہیں کر سکتی۔ پس ہم اس

حال میں کہ وجدان اخلاقی کو قبول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان فطرتاً اچھے کام سے لذت حاصل کرتا ہے اور برے کاموں سے دکھ اٹھاتا ہے اگر خدا اور خلقت اور خلقت کا ہدف دار ہونا درمیان میں نہ ہوتو ہمارا کام لغویت سے خارج نہیں ہوسکتا لیکن جہاں تک یہ وجدان اخلاقی ہے اور ہم معتقد ہیں کہ واقعاً وجود رکھتا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ اس وجدان کو خدا نے میرے لیے قرار دیا ہے کہ میں باہدف کام کو انجام دوں۔ پس متن خلقت میں میں اور وہ یتیم اور وہ بڑھیا ایک پیکر کے اعضا ہیں اور ایک ہی نقشہ کے جزو ہیں اور ایک ہی مشیت کی پیروی کرتے ہیں اور ایک حکمت کے تابع چل رہے ہیں اور ہدف خلقت اور ہدف خالق خلقت کو پورا کر رہے ہیں۔ اس صورت میں یہ امر معنوی بے کار نہیں ہے بلکہ حقیقی ہے۔ بنابراین ہر مکتب اور ہر نظام فکری اجتماعی معنوی نظریات کا حاجتمند ہے لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ آئیڈیا لوجی مافوق مادی ارزش کی حاجتمند ہے اور یہ ارزش قوی اور طاقتور ہونی چاہیے تاکہ ایک تقدس کی حامل ہوتو یہ کسی چیز کے تقدس کی نشانی ہے کہ انسان اس کو اس قدر سمجھے کہ اپنی انفرادی زندگی کو اس پر قربان کر دے۔

پس ہر مذہب و مکتب اس قسم کے اہداف اور ارزشہائے معنوی کی احتیاج رکھتا ہے۔ صرف منافع میں شرکت اور اس کی بنیاد پر ایک جامع مکتب انسانی کو نہیں بنایا جا سکتا۔ جس طرح کہ مارکسزم کی بنیاد ہے اور وحدہ لاشریک کی ذات کے ساتھ انسان کیلئے اس قسم کے اہم نظریات کو وجود میں نہیں لا سکتے اور وہ مکتب جو مدعی ہے۔

ابرو باد و مه و خورشید و فلک درکارند تاتوانی بکف آری و به غفلت نخوری

یعنی بادل و ہوا اور چاند وسورج اور آسمان کام میں مصروف ہیں تب جا کرتو نان کو حاصل کرتا ہے تو اس کو غفلت کے ساتھ نہ کھایا وہ مکتب کہتا ہے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي

الْاَرْضِ

کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ خدا نے جو کچھ زمین و آسمان میں

پیدا کیا ہے تمہارے سامنے مسخر کیا ہے [1]

صرف اس کیلئے مسئولیت کا قائل ہے اور کہتا ہے کہ متن خلقت میں ہر چیز کو کسی غرض کیلئے بنایا گیا ہے ہر چیز ایک مسئولیت اور وظیفہ رکھتی ہے۔ سورج کیلئے اس کی خلقت میں اس کی مسئولیت کو وویعت کیا گیا ہے اور وہ اپنی ذمہ داری کو انجام دے رہا ہے۔ بادل جو حرکت کرتا ہے اپنی ذمہ داری کو پورا کرتا ہے۔ بادل کی حرکت اپنی ذمہ داری کو پورا کرنا ہے ہوا کی حرکت یعنی ذمہ داری کو پورا کرنا ایک درخت کا پھل دینا اپنے وظیفہ کو انجام دینا ہے۔ پس انسان کو بھی مسئول بنا سکتا ہے۔ انسان ذمہ داریوں کے دریا کی مسئولیت رکھتا ہے لیکن وہ مکتب جو تمام چیزوں کو غرض و ہدف سے آزاد سمجھتا ہے کسی بھی موجود کائناتی کے انجام وظیفہ کا قائل نہیں ہے۔ پس ایک انسان کیلئے مسئولیت و ذمہ داری کو قرار دیتا ہے اس طرح کہ انسان واقعاً احساس کرے کہ وہ مسئول ہے۔ اپنا اور دوسروں کا مسئول ہونا۔ اس مسئولیت کی وجہ سے معنویات پر اپنے آپ کو قربان کرنے کو تیار ہوتا ہے کیوں اور کس حد تک حد اکثر کہہ سکتا ہے کہ لذت حاصل کرتا ہوں۔ البتہ یہ لذت خود لذت معنوی ہے کہ جس کو طبیعت نے انجام دیا ہے۔ بنابراین کسی مکتب کی معنوی ارزش بغیر کائنات کی تخلیق حکیمانہ کے اعتقاد کے قائل نہیں ہو سکتے ہیں بلکہ ایمان و یقین نہیں کر سکتے ہیں اور اس قسم کی متہائے آرزو ہر حرکت کا لازمہ ہیں کہ چاہیے کہ ان کو وجود میں لایا جائے۔ آرمان یعنی منتہائے آرزو یعنی اگر ہر انسان کیلئے انفرادی و شخصی زندگی میں منتہائے آرزو نہ ہو بلکہ بڑے کام منتہائے آرزو ہوں۔ چنانچہ روایت میں ہے کہ ایک مرد جس نے نئی شادی کی تھی اور زندگی کا آغاز کیا تھا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور آ کر کہا

---

[1] سورۂ لقمان: ۲۰

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آرزوئے شہادت رکھتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ مجھے شہادت نصیب ہو جائے۔ مذہب انسان کو کتنی بڑی آرزوئیں دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کو پالے اور شہادت تک پہنچ جائے اور یہ آرزو پیش پا افتادہ کے ساتھ درست نہیں ہے اور انسان کو اس طرح کا نہیں بنا سکتے۔ اس کے علاوہ کوئی مذہب نہیں ہے اور کوئی مکتب نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

بسمہ تعالیٰ

تیسری تقریر

مذہب اور کائناتی تصویر

گذشتہ ابحاث کو دوسری تعبیر کے ساتھ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک کامل مکتب اجتماعی اور ٹھیک آئیڈیا لوجی بھی ایک نظام فکری و فلسفی کا محتاج ہے اور ایک ایمان کی احتیاج رکھتا ہے۔ نظام فکری و فلسفی کو اسی طرح تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ خاص منطقی بصارت اور مزین با استدلال جہان کے بارے رکھتا ہو۔ منظم اور با ایمان ہو کہ آج کی اصطلاح کے مطابق Systematic ہو۔ یعنی ایجاد دل بستگی پر قدرت اور اہداف کے ساتھ عشق و محبت ہو اور ہدف فردی و شخصی اس نقص سے بالا ہو کہ جو بعض اجتماعی مذاہب میں پایا جاتا ہے بلکہ غالباً آج کے مکتب ہائے اجتماعی میں موجود ہے۔ مکتب Existencealism ہے کہ چاہتے ہیں Idealogy ہمراہ ایمان وجود میں لے آئیں یعنی ایسے امر کے ساتھ جو انسان سے بھی بالاتر اہمیت رکھتا ہوتا کہ انسان اس کی نسبت عشق پیدا کرے اور حقیقی طور پر وہ چیز انسان کیلئے جائے پرستش قرار پائے اور چاہتے ہیں کہ محض فلسفہ کی بنیاد پر مکتب کو وجود میں لے آئیں اور یہ کبھی بھی نہیں ہو سکتا اور فلسفہ محض ہمراہ ایمان کی بنیاد پر ہدف کے ساتھ دل بستگی برتر Idealogy ہے۔ البتہ Idealogy کامل انسانی نہیں ہے اور کبھی کبھار بشر دوری

پیدا کرتے ہیں کہ امر خیالی اور خیالی صلاحیات بشر سے استفادہ کرنے کیلئے خود Idealogy کو ایمان کا موضوع قرار دیتے ہیں کیونکہ اس کا احساس کرتے ہیں کہ Idealogy کی بنیاد ایمان پر ہونی چاہیے اور ہدف پر ایمان بالاتر اور برتر ہونا چاہیے۔ اس صورت میں کہ Idealogy وہ چیز ہے کہ چاہے وہ ایک ایمان پر مشتمل ہوتو چونکہ ایمان پر مشتمل ہوگی لہٰذا مقدس ہوگی اور اگر آئیڈیا لوجی ایمان پر مشتمل نہ ہو اور صرف ایک نظام فکری ہوتو چاہے موضوع ایمان قرار پائے یعنی مقام دل بستگی قرار پائے تو پھر یہ کسی طریقہ پر بھی پایہ منطقی نہ رکھے گی اور زور بازو پر اور تلقین و القا کے ساتھ قابل عمل ہوگی لیکن کسی مضبوط منطقی دلیل کے ساتھ نہ ہوگی اور ابھی گزشتہ یادداشتوں میں سے جو کہ مکتب کے بارے میں پیش کرتے ہیں۔ مکتب کی تعریف یہ ہے کہ مکتب ایک نظام فکری و عملی کو کہا جاتا ہے یعنی ایک فکری و نظری نظام نہیں ہے کہ جس کا تعلق نظریہ سے ہے نہ کہ کسی نظام عملی سے کہ جس پر عمل کیا جائے۔

ہمارے اپنے فلسفہ کی اصطلاح کے مطابق نظام فکری و نظری یعنی جو کچھ ہے اس کے بارے فکر کرنا۔ فرض کریں کہ ہم کہیں فزکس ارسطو ایک نظام فکری و نظری ہے یعنی ایک قسم کا طرز تفکر ہے جو کچھ ہے اس کے بارے میں کہ کس طرح ہے یا ہم کہتے ہیں کہ فزکس نیٹون بھی ایک دوسرا نظام فکری و نظری ہے اس کے بارے کہ جو کچھ ہے لیکن نظام فکری و عملی یعنی ایک فکری نظام اس چیز کے بارے جس کو ہونا چاہیے۔

گذشتہ مفکرین کی اصطلاح میں حکمت کی دو قسمیں ہیں۔ حکمت نظری اور حکمت عملی۔ چنانچہ حکمت نظری یعنی جو کچھ ہے اس کے بارے صحیح حکمت و ادراک کو حکمت نظری کہتے ہیں اور حکمت عملی یعنی صحیح اور واقعی ادراک اس چیز کے بارے جس کو ہونا چاہیے۔ بنابرایں مکتب ایک نظام فکری و عملی یعنی ایک نظام فکری اس کے بارے جس کا ہونا ضروری ہے برخلاف اس مکتب کے جو اس چیز کو پیش کر دیتا ہے جس میں انسان کیلئے بڑی آرزو پنہاں ہو۔ توحید اس قسم کی خصوصیت کی حامل ہے کہ ایک طرف

سے فلسفہ جہان بینی کی بنیاد ہے اور ایک قسم کی ہستی و وجود کے بارے دید و بنیش ہے اور دوسری طرف سے ایک قسم کی آروزو کہ کلمہ لا الہ الا اللہ میں ہے۔ چنانچہ جملہ نفی لا الہ میں مفہوم آرزو پنہاں ہے اور جملہ اثبات الا اللہ میں ہستی و جہان میں توحید کے اصل ہونے کو بیان کرتا ہے۔

ہمارے قدیم علما تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ توحید کی چند اقسام ہیں۔ توحید در ذات یعنی توحید ذاتی، توحید در صفات یعنی توحید صفاتی، توحید در اقوال یعنی توحید افعالی اور توحید درعبادت یعنی توحید عبادتی۔ چنانچہ توحید ذاتی پر اعتقاد کہ لیس کمثلہ شئی ''خداوند کریم مثل اور شریک نہیں رکھتا''۔ توحید صفاتی یعنی اس کی ذات اور اس کی صفات میں غیریت نہیں ہے اور پھر اس کی صفت دوسری صفت کے ساتھ غیرت نہیں رکھتی۔ یعنی تمام صفات و کمالات کو بطور بساطت و وحدت اپنی ذات کے اندر رکھتا ہے۔ اسی طرح توحید افعالی بھی ہے یعنی افعال میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور توحید عبادتی یعنی جس طرح وہ ہے اسی طرح اس کی عبادت کی جائے۔ وہ لائق عبادت ہے چنانچہ روح کی گہرائی سے اس کی عبادت کی جائے کیونکہ روح بشر میں اس کی بنیاد ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے۔

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

کیا دین خدا کے علاوہ کسی دین کی تلاش میں ہو، جبکہ جو کچھ آسمان وزمین میں ہے اس کے سامنے مطیع وفرمانبردار ہے۔[1]

جو عبادت ہم کرتے ہیں ایک قسم کی متابعت اور تسلیم اختیاری ہے عبادت تکوینی سے جو کہ تمام موجودات میں پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے۔

---

[1] سورۂ آلِ عمران: ۸۳

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ [1]
سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ [2]
وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ [3]

یہ اسی بنا پر ہے کہ جسے ہم عبادت میں توحید کو شمار کرتے ہیں ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ذات ایسی بشر کا واحد ارمان اور آرزو ہے۔ اس طریقے پر ذات ایسی یگانہ ہے نہ اس کے مانند کوئی ہے نہ اس کا کوئی مثل۔ اسی طرح اس کی ذات میں کسی قسم کی ترکیب نہیں جیسے وہ عالم کے تخلیق کا واحد منبع ہے۔ اسی طرح اس کی ذات واحد ہے کہ صرف وہی ذات بشر کی معبود ہے اور اس لائق ہے کہ بشر اس کی پرستش کرئے یہ سبب ہے کہ ہم توحید کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ اس میں دو خاصیتیں ہیں۔ ایک طرف اس میں دو انداز نظر ہے جس سے اشیاء کو جانچا جاتا ہے اور دوسری طرف سے اس میں وجود کے بارے میں اس کی قدر و قیمت کا شعور او دوسری طرف سے اس میں انسانیت کیلئے ایک ہدف ہے۔

جہاں تک مارکیست کا تعلق ہے اس کی یہ کیفیت نہیں۔ مارکسی انداز نظر خالص مادی انداز نظر ہے۔ یہ مادی انداز نظر ایک شے ہے اور وجود کے بارے میں اس کی قدرو قیمت کا تعین دوسری بات ہے۔ فلسفہ کا ایک اور انداز ہے جس میں وجود کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مارکیست اپنے مادی انداز نظر سے بھی جینے کا انداز اور زندگی کی سمت معین میں اپنا اثر رکھتی ہے لیکن بذات خود وہ ہدف نہیں آرزو نہیں۔ اسی طرح مادیت بشر کو وہ آرزو وہ ہدف نہیں دیکھا سکتی جو مارکیست پیش کرتی ہے ااور جس کا تعلق اقتصادی پہلو سے ہے، خالص مادیت سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں اقتصادی مارکسیت جو انسان کو ایک ہدف دیکھاتی ہو وہ ہدف بھی انسانی ہدف نہیں یعنی وہ محروم

---

[1] سورۂ الجمعہ:۱

[2] سورۂ صف:۱

[3] سورۂ رعد:۱۴

طبقے کو اور انسانی منفعتوں کو بطور ہدف پیش کرتی ہے۔ جیسے کہتی ہے کہ اے محروم طبقے کے لوگوں کوشش کرو کہ اپنے حقوق حاصل کرو جن کے حدود یہ ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ہدف سازی اور یہ آرزو اور یہ آئیڈیالوجی ناقص ہے کیونکہ یہ آرزو صرف اس وقت تک ہے جب تک انسان اپنے ہدف کو حاصل نہ کرے جب وہ اس ہدف تک جا پہنچتا ہے تو وہ یہ سوچتا ہے کہ اب کیا ہونا چاہیے اور کس طرح ہونا چاہیے جب وہ اس ہدف تک آن پہنچتے ہیں جس کا مقصد حکمران طبقے کو ظلم و استبداد کی قدرت سے محروم کرنا ہے۔ اب اس کے بعد نہ کوئی آئیڈیالوجی سامنے رہتی ہے اور نہ کوئی ہدف۔

علاوہ ازیں مارکیست یہ نہیں کرسکتی کہ وہ اپنے آپ کو مقدس ہدف کی شکل میں پیش کرے۔ مادی ہدف سو فیصد مادی ہوتا ہے اور وہ ایسا ہدف نہیں جو مافوق انسان اس لیے اس دبستان میں جتنی قدو کاوش ہو وہ ساری کی ساری بے منطقی ہو گی کیونکہ اس طریقے سے وہ اپنے ہدف اور اپنی آروزو کے خلاف کام کر رہی ہیں یہ انسان (یا یہ مارکسیت) کوشش کرتا ہے اپنے مفاد کو حاصل کرنے اور اس کیلئے ہر قسم کی قربانی اور اپنے پورے وجود کو اس راہ میں قربان کرتا ہے۔ اب یہ کیسا ہدف ہے کہ جس کی راہ میں انسان اپنے آپ کو ختم کر دے۔

مارکسیت کوئی آرزو کوئی ہدف نہیں بلکہ ایک طرح سے بے ہدفی ہے اور فرد کی جبلی خواہشات کی بازگشت ہے دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ چیز جو جہاں بینی کی اصل ہے وہ فردی یا اجتماعی آرزو یا تصور نہیں۔

مارکسیت کی طاقت اس میں پنہاں ہے کہ وہ پرانی زنجیروں کو توڑ دیتی ہے اور پرانے تصورات کو ختم کر دیتی ہے۔ اس کے علاو اس میں یہ قدرت نہیں کہ وہ زندگی کے عمومی پہلو مثلاً سیاسی، اجتماعی، اقتصادی اور اخلاقی پہلوؤں کو براہ راست متاثر کر سکے ہاں! بالواسطہ طور پر اس کے اثرات ہیں اور اس صورت میں عدالت اور اخلاق کے موضوعات پر اپنے مفہوم کو واضح کرتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس دبستاں کی روح اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ

اور جو چیز اس سلسلے میں زیادہ اثر پیدا کرنے والی ہے وہ اس علت ومعلوں کا ارتباط ہے۔ یہ ہی ہدف اور امید وہ چیز ہے جو جہاں بینی کو ایک مکتب ایک دبستاں کی تصویر دیتی ہے ۔ اسی بنا پر ہر وہ جہاں بینی جو اس روح دبستاں کو تشکیل دے اگر اس میں یہ صلاحیت نہیں کہ اس کو ہدف عطا کر سکے وہ جہاں بینی نہیں کیونکہ اس کی نگاہیں کسی ہدف پر اور کسی امید پر مرکوز نہیں۔

انسان اپنی کوششوں میں نہ تو مستقبل پر نگاہ رکھتا ہے نہ حال پر اور نہ ماضی پر یہ جہان کیا چیز ہے کیسے تھا اور کس رنگ میں ہے۔اس کا اس بات سے کیا رابطہ ہے۔اگر میں یہ چاہوں تو اپنے ارادے کے مطابق اپنے آئیڈیل بنا سکوں۔ دوسرے لفظوں میں خالی فلسفہ کافی نہیں جتنی قسم کی جہاں بینیاں ہیں ان پر ایک نگاہ ڈالی ڈالیں تو ان میں فرق نظر آئے گا۔ یہ اس لیے ایک میں عہد کی پیدائش ہوتی ہے اور دوسرے میں نہیں یعنی ایک جہاں بینی انسان کیلئے مسئولیت اور ذمہ داری پیدا کرتی ہے اور دوسری نہیں۔

توحیدی جہان بینی تعہد پیدا کرتی ہے۔ اس کے برخلاف غیر توحیدی جہاں بینیاں اور ہمارے تمام افکار مثلاً اگزسٹنشلزم(Existentialism) کس طرح کوشش کرتی ہے کہ تعہد پیدا کرے۔

یہ سوچ ہمیں کہیں نہیں پہنچاتی کیونکہ اس کی اساس کوئی نہیں۔ یہ جس قدر باتیں تعہد، التزام اور ذمہ داری کے بارے میں کہی جاتی ہیں ان کے متعلق یہ معلوم نہیں کہ ان کی اساس کیا ہے۔ میں ذمہ دار ہوں صرف اسی دلیل کی بنا پر کہ میں آزاد ہوں یہ آزادی سوائے اس کے کوئی معنی نہیں رکھتی کہ دوسرے آزاد نہیں اگر میں مجبور ہو جاؤں اور اپنی آزادی ہاتھ سے دے بیٹھوں اس کا مطلب یہ ہے کہ میں خود نہیں ہوں بلکہ کوئی دوسرا ہے لیکن جب میں سو فیصد آزاد ہوں اس کے کیا معنی ہیں۔

البتہ جس آزادی کا ذکر وہ کرتے ہیں بنیادی طور پر اس کا کوئی مفہوم نہیں ہے اور سو فیصد غلط ہے کیونکہ یہ اس آزادی کے مقابلے میں ہے جسے اشاعرہ پیش

کرتے تھے جو چاہتے تھے کہ ثابت کریں کہ انسان اپنے ارادہ میں بالکل آزاد ہے اور کسی چیز کے ساتھ اس کا کوئی ربط نہیں ہے البتہ اس بات پر بہت بڑا اعتراض وارد ہوتا ہے لیکن بہر حال فرض کرتے ہیں کہ میں آزاد روں اور کسی قسم کا کوئی جبر مجھ پر حکومت نہ کرے اور انسان اس کی اطاعت کرے اس قسم کی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی جس پر ماحول کا بھی کوئی وجود نہیں ہے اور جبر الٰہی بھی نہیں ہے اور میں آزاد مطلق ہوں۔ پس اس صورت میں ان کے قول کے مطابق میں اپنا مسئول خود ہوں۔ حد اکثر اس بات کے معنی یہ ہوئے کہ کوئی عامل میرا مقصر نہیں ہے۔ میں اگر بدبخت ہوا تو اس کا میں خود مقصر ہوں لیکن کیا اس معنی کے اعتبار سے دوسروں کی مسئولیت بھی ہے کہ میں کہوں میں انتخاب میں خود ذمہ دار ہوں جس چیز کو چاہوں منتخب کروں۔ اس قسم کی چیز کو منتخب کروں جس سے دوسروں کو بھی فائدہ حاصل ہو۔

چاہتے ہیں دوسروں کی ذمہ داری بھی میری گردن پر ڈال دیں۔ یہ احساس مسئولیت میرے لیے کہاں سے پیدا ہوا۔ اگر کہہ دیا جائے کہ میں دوسروں میں تاثیر رکھتا ہوں۔ میرا مسئلہ اس طرح کا ہو لیکن مسئولیت کا مطلب دوسرا ہے۔

اولاً تو دوسرے بھی آزاد ہیں۔ وہ آزادی مطلق دوسروں کی مسئولیت کے ساتھ ساز گار نہیں ہے۔ اس طرح آزادی کر سکتے ہیں کہ جس میں نمونہ ہونا بھی معنی نہیں رکھتا کہتا ہے چونکہ میں آزاد ہوں لہٰذا اپنی ذات کا خود ذمہ دار ہوں۔ کسی بھی راستے کو اختیار کروں اس کا معنی یہ ہوگا کہ اس کو خوب جانتا ہوں اور طلاب کے قول کے مطابق اس کو دلالت التزامی کہتے ہیں کہ اس راہ کو انتخاب کریں میں اپنے راستے کو کلیت دوں گا پس کہوں گا کہ یہ راستہ اچھا ہے میرے لئے بھی اور دوسروں کیلئے بھی تو دوسروں کو بھی اس راستے کی طرف دعوت دوں گا، چنانچہ ہم نے کہا ہے کہ دوسرے بھی آزاد ہیں اور کوئی عامل کسی کے ارادہ کا مرجع قرار نہیں پائے گا جبکہ دوسروں کے انتخاب میں تاثیر کا مسئلہ ہے۔

ثانیاً فرض کرتے ہیں اور اس مطلب کو قبول کریں کہ البتہ یہ مطلب یہاں تک درست ہے۔ **و کونوا دعاۃ الناس بغیر السنتکم** کا مطب یہی ہے تو جو کام میں کرتا ہوں اس کا معنی یہ ہے کہ میں نے اس کو خوب اچھے طریقے سے تشخیص دیا ہے۔ دوسروں کو بھی عملی طور پر اس کی طرف شوق دلاؤں گا۔ دوسروں کے انتخاب میں بھی مؤثر ہوں گا اور یہ تاثیر میں اس احساس مسئولیت کے علاوہ ہے جو میں اپنے وجدان میں پاتا ہوں کیونکہ اس مسئولیت کا میرے وجدان میں ہونا ضروری ہے کہ میں موثر ہوں اس سے بالاتر نہیں ہے کہ میں درک کرتا ہوں کہ دوسروں کیلئے بدبختی کا عامل ہوں لیکن اس تعہد کو میرے اندر کون ایجاد کرے گا کہ میں عمل نہ کروں اور یہ کہوں کہ اس سبب سے کہ میں اپنی ذات کو مسئول نہ سمجھوں تو کس کیلئے مقام سوال ٹھہروں گا، آیا خدا وجود رکھتا ہے کہ سوال کرے۔ کہتے ہیں نہیں۔ آیا وجدان ہے کہا نہیں۔ پس کون ہے؟ جہان بینی توحیدی اس دلیل کے ساتھ کہ ہدف ساز اور تعہد آور اور مسئولیت ساز ہے ہدایت کرتی ہے دوسری خصوصیت کہ ہدایت کرتی ہے یعنی راستے کو انسان کے سامنے پیش کرتی ہے ایسا راستہ جو کہ اہداف تک پہنچائے اور اس کے علاوہ مسرت آمیز و ولولہ انگیز ہے۔ مزید برآں قربانی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔

اس سے بھی بالاتر جس کو علامہ طبا طبائی نے فرمایا ہے کہ تمام کیلئے عناصر سے عنصر تعلیمات ہوسکتا ہے جس طرح کہ اصل امتناع تناقص وہ اصل ہے کہ تحلیل کے وقت تمام قضایا کی بازگشت اسی اصل کی طرف ہوتی ہے اور اس کے علاوہ کسی اصل پر یقین نہیں آتا۔ یہ لا اقل کسی اصل کا یقین اصل مخالف کے احتمال کی نفی نہیں کرتا۔ اسی طرح اصل توحید اس صلاحیت کو رکھتی ہے کہ پانی کی طرح تمام دوسرے تفکرات کو سیراب کرتی ہے اور خون کی طرح تمام اجزا کو غذا پہنچاتی ہے اور روح کی طرح تمام اعضائے بدن کو زندگی بخشتی ہے اور اہداف کے مواقع پر اس مکتب کی قوت متحرکہ بن جاتی ہے، بقول مارکس کہ انسان کو کسی حد پر توقف نہیں کرنا چاہیے اور ہمیشہ اپنی حدود کو

توڑتا رہے اور راستوں کو بدلتا رہے۔ جب ان تک پہنچے دوسرا ہدف اختیار کرے اور اسی طرح آگے بڑھے۔ اس معنی کے اعتبا رسے کہ حرکت لا متناہی جس کا ہدف ابتدا سے مشخص نہیں ہے کو انجام دے اسی قدر کہ ہمیشہ حالت حرکت میں رہے اس شخص کی طرح جو کہ راستہ چل رہا ہے مگر مختصر طور پر اس کا راستہ کھلا ہو لیکن بعد کو نہیں جانتا جب کچھ آگے بڑھتا ہے تو اس کی آنکھوں کے سامنے دوسرا راستہ کھلتا ہے اور اسی طرح آگے بڑھتا رہتا ہے لیکن موجودہ حال سے آخری ہدف کو نہیں جانتا اور واضح طور پر آخری ہدف کو نہیں پہچانتا کیونکہ نہیں چاہتا کہ کسی نقطہ ثابت تک پہنچے کیونکہ اس کو نقطہ مرگ سمجھتا ہے لیکن توحید میں جب ابتدا ہی سے ہدف واضح ہے تو غیر متناہی ہے اور اس کو فوق العادۃ اہمیت حاصل ہے کیونکہ ذات ہدف لا متناہی ہے اور انسان کیلئے ہمیشہ تازگی رکھتا ہے اور کسی وقت بھی وہ پرانا نہیں ہوتا۔ پس کوئی بھی جہان بینی اس بات کی صلاحیت نہیں رکھتی کہ ایک مکتب کی روح اور بنیاد بن سکے کہ اس مکتب کا ہدف بھی ہو اور اس کی قوۃ محرکہ بھی ہو خواہ وہ غایت و ہدف عطا کرے ۔ خواہ وہ ایجاد مسئولیت کرے اور خلاصہ کے طور پر قوت محرکہ بھی ہو اور تعہد آور اور مسئولیت آور اور ذاتی عادات کے مطابق رہنما و ہادی ہو کہ اہداف تک پہنچنے کے راستے کو متعین کرے اور نشاط بخشی اور فدا کاری کی خصوصیات بھی رکھتی ہو اور غذا کی مانند تمام بدن تک پہنچ جائے اور تمام اعضا کو زندہ و برقرار رکھے اور اس طرح کا نفوذ رکھتی ہو کہ مثل اصل کے تمام مسائل کی تحلیل کا مرکز بن جائے تو ہمارے عقیدہ کے مطابق صرف جہان بینی توحیدی ہے کہ جو ان تمام خصوصیات کو اپنے اندر رکھتی ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو منظم کر سکتی ہے۔ کوئی اور جہان بینی اپنے اندر اس قسم کی خصوصیات نہیں رکھتی جو کہ تمام تر بشری تقاضوں کو پورا کر سکے۔

چوتھی تقریر

ایمان اور انسانی کمال

اسلام میں ہدف اور ہدف پر ایمان کے بارے بحث کی مناسبت سے ایک بنیادی مسئلہ جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ایمان جو کہ اسلام میں واضح ہے اور تمام قرآن میں اس کا تذکرہ ہے اور تمام مسائل کا مرکز ہے وہ ہے کیا؟

البتہ قرآن میں خدا پر ایمان درجہ اول پر اور باقی تمام چیزوں پر ایمان درجہ دوم پر بیان ہوا ہے۔ مثلاً ملائکہ پر ایمان، کتابوں اور رسولوں پر ایمان اور قیامت کے دن پر ایمان درجہ دوم پر ہے لیکن کیا اسلامی نقطہ نظر سے بنیادی طور پر انسان کیلئے ایمان ہدف ہے یا وسیلہ؟ یعنی انسان کا مومن ہونا ضروری ہے اور اسلام انسانوں سے ایمان چاہتا ہے۔ ایمان خود ہدف ہے یا دوسرے اہداف کیلئے وسیلہ ہے البتہ توجہ رکھیں کہ یہ تمام اہداف انسان کیلئے مقصود و مطلوب ہیں لیکن میں نہیں کہتا ہوں کہ پرور دگار کیلئے ایمان ہدف ہے یا پرور دگار کے دوسرے اہداف کیلئے وسیلہ ہے۔ اہداف یعنی کمالات اور انسانی اہداف۔

لیکن کیا انسان کا کمال خود ایمان ہے؟

اور یہ کہ ایمان کی طرف جو دعوت دی گئی ہے اس اعتبار سے ہے کہ ایمان اصولاً کمال انسانی ہے اور نفس کمال انسان خود ایمان ہے یا اس اعتبار سے ایمان کی

طرف دعوت دی گئی ہے کہ ایمان کے کچھ آثار ہیں اور وہ آثار انسان کیلئے اچھے ہیں۔ پس ایمان ایک ایسی چیز ہے جو کہ انسان کیلئے نفع بخش ہے یعنی نیک آثار رکھتا ہے اور اگر چاہیں تو فلاسفہ کی اصطلاح کے مطابق اس طرح کہیں آیا انسان کیلئے ایمان خیر ہے یا نافع ہے؟ کیونکہ خیر و نافع میں فرق ہے خیر وہ چیز ہے جس کی ذات خود کمال اور مطلوب انسان ہے یعنی انسان اپنے لیے اس کو طلب کرے نہ کہ کسی دوسری چیز کیلئے، لیکن نافع وہ چیز ہے جو کہ اچھی ہے اس اثر کیلئے جو کہ اپنے اندر رکھتی ہے فی الواقع خیر کا مقدمہ ہے نہ اس طرح کہ بذات خود خیر ہو۔ اس مطلب کو شناخت اسلام میں ایک مکتب کی صورت میں قطعی طور پر واضح ہونا چاہیے کہ اسلامی نقطہ نظر سے آیا ایمان خود ہدف اور مطلوب ہے اور انسان کیلئے خیر ہے اور اسلام کا ایمان کی طرف دعوت دینا اس اعتبار سے ہے کہ نفس ایمان انسان کیلئے خیر ہے قطع نظر اس بات کے کہ جو اثر بھی رکھے۔ اگر چہ کوئی اثر ان آثار سے جو ایمان رکھتا ہے، نہ رکھتا ہو یا خیر کوئی دوسری چیز ہے اور انسان کو اس اعتبار سے ایمان کی طرف دعوت دی گئی ہے کہ ایمان خیرات کا مقدمہ ہے، اس طرح جب ہم معمولاً ایمان کے بارے بحث کرتے ہیں تو ایمان کے فوائد اور اس کے آثار کے بار کے بحث کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ انسان ایمان رکھتا ہو تو اس کا دل مطمئن ہوتا ہے اور اس کی مصیبتوں میں کمی کر دیتا ہے اگر معاشرہ کے افراد ایمان دار ہوں تو ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں اور ان کا خیر ایک دوسرے کو پہنچتا ہے اور ان کا شر اور نقصان ایک دوسرے کو نہیں پہنچتا۔ ہم اس طرح ایمان کے آثار کے بارے گفتگو کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ایمان کے اس قسم کے آثار ہیں لیکن کیا اس وجہ سے اچھا ہے کہ اس قسم کے اچھے آثار رکھتا ہے یا نفس ایمان انسان کیلئے کمال ہے خیر ہے سعادت ہے اور انسان کو چاہیے کہ ایمان کو پیدا کرے تو صرف ایمان کی وجہ سے ہے نہ اس وجہ سے کہ ایمان دوسرے آثار بھی رکھتا ہے۔ پس یہاں سے یہ بحث سامنے آتی ہے کہ اصولاً انسان کا کمال کس میں ہے اور اس بات کو سمجھنے کیلئے کہ ایمان کمال اور

خیر ہے یا خیر وکمال کیلئے مقدمہ ہے پہلے اس مسئلہ کو سامنے لانا ضروری ہے کہ کمال انسان کیا ہے اور یہ دیکھیں کہ کمال انسان کس میں ہے۔

کمال انسان کی تشخیص دوسری چیزوں کے کمال کی تشخیص سے مشکل تر اور دشوار تر ہے۔

انسان کے بارے مجہولات انسان میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ کمال انسان کس چیز کے ساتھ ہے؟ دنیا کی چیزوں کے کمال کو ہم زیادہ سے زیادہ اچھے طریقے سے تشخیص دے سکتے ہیں مثلاً اگر ہم کو کہا جائے کہ ایک کامل سیب کی تعریف کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کامل سیب کو اس طرح ہونا چاہیے کہ کمال کو حد اکثر حالت میں اپنے اندر رکھتا ہو۔ کمال کوئی دوسری تعریف نہیں رکھتا کہ کمال جس کے مقابل کا نقطہ نقص ہے کی تعریف کریں اور مفہوم تو تقریباً واضح ہے۔ ایک کامل سیب کی تعریف تو انسان کر سکتا ہے کیونکہ سیب میں جو کچھ مطلوب ہے اسی نسبت سے سیب کو سیب کہتے ہیں۔ ایک تو اس کے ذائقہ کی وجہ سے اور دوسرے اس کی لطافت اور رنگ کی وجہ سے اور بالآخر اس کی شکل کی وجہ سے اگر سیب ہو، شکل و رنگ میں خوبصورت ہو، ذائقے میں خوش ذائقہ اور میٹھا ہو، اس کی بو خوشبو ہو اور اس کی لطافت لطیف ہو اور کھانے میں انتہائی نرم ہو تو اس کو استفادہ کی صورت میں کامل سیب کہا جاتا ہے۔

ایک کامل گھر کی تعریف کرنا آسان ہے۔ ایک کامل گھوڑے کی تعریف کر سکتے ہیں لیکن کامل انسان کی تعریف دوسری چیزوں کی تعریف سے مشکل تر اور دشوار تر ہے لہٰذا ان تمام مختلف نظریات کو جو ایک کامل انسان کے بارے میں پیش کئے گئے ہیں ان کو بیان کیا جائے تا کہ معلوم ہو سکے کون سا نظریہ درست ہے اگر چہ اجتہاد تک نہ پہنچیں کم از کم مشخص تو کریں قرآن کس نظریہ کی تائید کرتا ہے اور کس حد تک قرآن نے اس کی تائید کی ہے۔ تو پہلی چیز جس کو پیش کیا جا سکتا ہے وہ ہے کامل انسان یعنی

انسان برخوردار یا انسان کمال یافتہ یعنی وہ انسان جو اپنی طبیعت سے خارج از محیط زیادہ سے زیادہ برخورداری کو رکھتا ہو تو مسلماً یہ تعریف غلط ہے۔ کمال انسان برخورداری کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتا کہ جو بھی خارج کی چیزوں سے زیادہ استفادہ اور بہرہ برداری کرے، کامل تر ہے کیونکہ اولاً ہم کسی دوسری چیز کی تعریف اس طرح نہیں کرتے۔ ہم ہرگز کامل گھوڑے کو اسپ برخوردار نہیں سمجھتے۔ گھوڑے کو اس کی صفات میں اور اس کو وضع خاص میں دیکھتے ہیں کہ کس طرح کی صفات اس کی ہونی چاہئیں۔ کامل گھوڑا وہ نہیں ہے کہ جس نے مثلاً گزشتہ رات کو زیادہ گھاس کھائی ہو یا مثلاً کامل سیب اس کو نہیں سمجھتے جو سیب طبیعت سے یعنی ہوا، پانی، روشنی سے زیادہ برخورداری کرے۔ ثانیاً کون سا وجدان ہے جو اس مطلب کو قبول کرے گا کہ کامل ترین انسان وہ ہیں جو برخوردارترین انسان ہوں کیونکہ اس کا لازمہ یہ ہے کہ جو انسان طبیعت سے کم بہرہ برداری کرے گا وہ ناقص تر ہے اور جو طبیعت سے زیادہ بہرہ برداری کرے گا وہ کامل تر ہوگا اور جو کم بہرہ برداری کرے گا وہ ناقص تر ہے بنا برایں اگر ہمارے پاس دو انسان ہوں ایک معاویہ جیسا ہو جس کی تمام تر کوشش دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا ہو جس طرح بھی ہو کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی عمر کے آخری زمانے میں کہا کہ ہم نے دنیاوی نعمتوں سے بہت غلط قسم کا استفادہ کیا ہے اور واقعاً اس نے شام پر حکومت کی ہے اور ان چالیس سالوں میں سے بیس سال والی مقتدر بن کے رہا اور بیس سال دوسرے خلیفہ مقتدر بنا رہا ہے اور دوسرا انسان رہا ہے۔

اور دوسرا انسان حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے ہو کہ جس کی ساری زندگی اس جہان فانی میں زاہدانہ گزری ہے اور اپنے زہد میں حکمت و فلسفہ رکھتے ہیں اور ان کی زاہدانہ زندگی کا وہ فلسفہ یہ تھا کہ چاہتے تھے کہ آزاد زندگی گزاریں یا ایثار و قربانی کریں یا دوسروں سے ہمدردی کریں یا دنیا کا قیدی بن کر نہ رہیں اور اپنے دل کو خالصتاً معنویت و روحانیت کیلئے خاص کر کے رکھیں۔ جو کچھ بھی ہو بہر حال جو بھی کوئی

سبب ہو، وہ انسان جس نے اس دنیا سے سترہ من نان جو کھایا ہو۔ انسان ناقص ہے کہ جس نے اس دنیا سے بہت کم بہرہ برداری کی ہے۔

اگر اس طرح کی بات کو قبول کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے انسان کو حیوان سے بھی بدتر کر دیا ہے کیونکہ کسی بھی حیوان کو برخورداری کے معیار پر با کمال نہیں سمجھا جاتا۔ اگر صحیح طریقے سے توجہ کی جائے تو بہت سے افراد انسان کے بارے سوائے برخور داری کے کوئی فکر ہی نہیں کرتے اور ہر چیز کو اگر وہ مقدمہ برخورداری انسان ہوتو انسان کا کمال اصلی سمجھ لیا ہے۔ یہ مطلب صحیح نہیں ہے یہاں پر ایک اور مطلب سامنے آ جاتا ہے جو کہ انتہائی گہرا مطلب ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی انسان اس بات کا قائل نہیں ہے کہ جو طبیعت (یعنی دنیاوی چیزوں) سے زیادہ بہرہ برداری کرے وہ کامل ترین انسان ہے جس کا لازمہ تمام معنویت و روحانیت کی نفی ہے ہر عمل انسانی کی نفی ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ قربانی غلط کام ہے کیونکہ قربانی ایک قسم کا تنزل اور نیچے گرنا ہے لیکن دوسرا مطلب ہے جو بہت سوں کے ذہن میں موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ درست ہے دنیا کی نعمتوں سے بہرہ برداری کمال انسان نہیں ہے لیکن برخور داری آخرت کس طرح ہے (یعنی آخرت میں فوائد کا حاصل کرنا) یعنی ہم یہ کہیں کہ کمال انسان فوائد کے حاصل کرنے میں ہے لیکن آخرت کی برخورداری، فوائد دنیاوی کو نہیں کہتے کیونکہ آخرت میں محرومیت کا سبب بن جاتے ہیں ایک خاص نظریہ کے مطابق لیکن آخرت میں فوائد کا حاصل کرنا کوئی مانع نہیں رکھتا، انسان کا کمال صرف فوائد کے حاصل کرنے میں ہے اور پرور دگار کی نعمتوں سے بہرہ برداری میں ہے۔ البتہ دنیا میں زیادہ حاصل نہیں ہوتے بلکہ زیادہ تر آخرت میں اور جنت میں میسر ہوں گے۔ لہٰذا عمومی طور پر زاہد اس وجہ سے عبادت کرتے ہیں تا کہ آخرت میں ان کو بہت زیادہ اجر وثواب یعنی فوائد حاصل ہوں۔ عبادت صرف جنت حاصل کرنے کے لالچ میں کرتے ہی اِمگر عبادت فوائد کے حصول سے زیادہ اجر کی حامل ہے چونکہ عبادت

مقدمہ ہے فوائد کے حصول کیلئے لہٰذا طبعاً ہر ذی المقدمہ اپنے مقدمہ پر افضل اور اشرف ہوتا ہے۔ عبادت وسیلہ ہے ان فوائد کے حاصل کرنے کیلئے علامہ بوعلی سینا اشارات کی فصل دوم میں فرماتے ہیں۔

العبادة عند غیر العارف معامله یعمل فی الدنیا لیا خذاجرا فی الاخرة

یعنی وہ عبادت کرتا ہے اس کاریگر کی طرح جو کام کے بعد مزدوری کا طلبگار ہوتا ہے۔

کاریگر کا ہدف وہ پیسے ہیں جو وہ کام کرنے کے بعد لیتا ہے اگر پیسے نہ ہوں تو کبھی کام کرنے کو تیار نہیں ہوتا تو یہ شخص بھی صرف آخرت کے فوائد کو حاصل کرنے کیلئے عبادت کرتا ہے۔

بنابراین کمال انسان کی برگشت پھر فوائد کا حاصل کرنا ہے اگر چہ دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں تو از نظر منطق اسلام یہ مطلب مسلم الثبوت ہے کہ جو عبادت آخرت کے فوائد کو پانے کیلئے کی جاتی ہے وہ بہت ناقص عبادت ہے۔

یعنی عبادت کی حقیقت بس اتنی سی ہے کہ انسان اس عبادت کے ذریعے خدا سے اور مزدوری چاہتا ہے کیونکہ خدا کو اس نے وسیلہ بنایا ہے اور خدا کی طرف بس اتنا ہی متوجہ ہے کہ خدا سے آخرت اور جنت چاہتا ہے اور عبادت کرتا ہے تا کہ خدا کے حکم کی اطاعت کرے اور اس کے بدلے اس کو جنت مل جائے۔ یہ عبادت ہے مگر خدا کو اس عبادت میں کسی چیز کے حصول کیلئے وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ ائمہ اطہارؑ کے فرامین میں بہت زیادہ ملتا ہے اور نہج البلاغہ میں بھی ہے۔

قوم عبد واللہ طمعاً و تلك عبادة الاجراء یا عبادة التجارہ و قوم عبد واللہ خوفا و تلك العبادة العبید

''وہ لوگ جو لالچ کی وجہ سے عبادت کرتے ہیں یہ تاجرانہ

عبادت ہے اور وہ لوگ جو خوف کی وجہ سے عبادت کرتے ہیں
ان کی عبادت غلاموں والی عبادت ہے جو کہ اپنے مالکوں کے ڈر
سے کام کرتے ہیں۔''

و قوم عبد والله شکراً اور نہج البلاغہ میں ہے۔**یا قوم عبدوالله احباله**۔مختلف عبارات میں اس قسم کے جملے آئے ہیں۔

یعنی ایک گروہ عبادت کرتا ہے نہ خوف کی وجہ سے نہ لالچ کی وجہ سے بلکہ حکم خدا اور اطاعت حکم خدا کی وجہ سے اور اس کو لائق عبادت سمجھتے ہیں یعنی اگر ثواب نہ ہو، جنت کا لالچ نہ ہو، جہنم کا خوف نہ ہو پھر بھی خدا کی عبادت کرتے ہیں اور وہ جملہ جو حضرت امیر المومنینؑ کا معروف جملہ ہے اور گزشتہ تمام عبارتوں سے صریح تر عبارت ہے فرماتے ہیں:

الٰهی ماعبدتك خوفاً من نارك ولا طمعاً فی جنتك بل وجدتك اهلاً للعبادة فعبدتك

'' خداوندا میں تیرے ڈر کی وجہ سے یا تیری جنت کی لالچ
میں تیری عبادت نہیں کرتا بلکہ تجھے لائق عبادت پایا ہے پس تیری
عبادت کرتا ہوں۔''

پس یہ ایک نظریہ تھا کمال انسان کے بارے میں جو کہ بہرہ برداری کے حوالے سے تھا لیکن دنیا میں اس کو ہر فضیلت کی نفی شمار کریں اور بہرہ برداری کو آخرت پر چھوڑ دیں پھر بھی مطلب درست نہیں ہے۔ وگرنہ اصولاً کامل ترین عبادت صرف بہرہ برداری کیلئے ہوگی اور اب ہم نے جب سمجھ لیا ہے کہ ناقص ترین عبادت وہ ہے جو فائدہ حاصل کرنے کیلئے ہو تو پس نہیں کہا جا سکتا کہ کمال انسان دوسروں سے زیادہ انسان کا بہرہ برداری کرنا ہے۔ ان نظریات کے عاوہ اور بھی نظریات ہیں مگر بعض روحانی اور بعض مادی ہیں۔پس جتنے مادی نظریات ہیں سب کی برگشت نظریہ

برخورداری کی طرف ہے۔ البتہ روحانی نظریات کچھ اس ترتیب سے ہیں۔

اولین نظریہ

پہلا اور مہم ترین نظریہ جس میں بحث کی جا سکتی ہے وہ عرفا کا نظریہ ہے اور بنیادی طور پر عرفا نے بحث انسان کامل کو انسان کامل ہی کے نام سے واضح کیا ہے اور شاید یہ کہا جا سکے کہ عرفا نے اس نظریہ کو ادیان سے لیا ہے۔

انسان اول کے مسئلہ سے جو کہ ادیان میں ہے مسئلہ آدم اور بطور کلی مسئلہ نبی اور ولی اور انسان کامل آخر الزمانؑ مہدیؑ موعود کہ تمام ادیان میں ہے الہام لیا ہے۔ ما سینیوں کی مشہور و معروف کتاب ہے جو کہ انسان کامل در اسلام کے عنوان سے ہے جس کا عبدالرحمن بدوی نے عربی میں ترجمہ کر دیا ہے۔ ما سینیوں اس کتاب میں کہتا ہے کہ فرضیہ انسان کامل میراث ھلی یعنی میراث یونانی نہیں ہے۔ فلسفہ یونان نے اس انسان کامل کے بارے میں کوئی بحث نہیں کی ہے۔

جہاں اسلام میں عرفا نے انسان کامل کی بحث کو واضح کیا ہے اور پھر عرفا کے درمیان محی الدین عربی نے انسان کامل پر بہت زیادہ بحث کی ہے، دوسروں نے بھی انسان کامل کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں، جناب عبدالکریم دیلی نے بھی بنام انسان کامل کتاب لکھی ہے جو کہ چھپ چکی ہے۔ عزیز الدین نسفی نے بھی الانسان الکامل نامی کتاب لکھی ہے اور سید محمد برقعی جو کہ مرحوم آقائی مرزا سید حسن کے بھائی ہیں نے الانسان الکامل کے عنوان پر کتاب لکھی ہے جو کہ خود ایک عارف اور شاعر انسان تھے۔ خود عرفا اپنے مسلک کے مطابق کمال انسان اور انسان کامل کے بارے روشن و واضح نظریہ رکھتے ہیں۔

اگرچہ دوسروں کیلئے قابل قبول نہ ہو لیکن ان کے اپنے نظریہ کے مطابق قطعی فیصلہ کرتے ہیں اور عجیب وغریب قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ عرفا معتقد ہیں کہ حقیقت ایک ہے اور کچھ نہیں اور وہ خدا ہے، وہ غیر خدا کو حقیقت نہیں سمجھتے ہیں بلکہ ایک قسم کا

حقیقت کا سایہ و چہرہ جانتے ہیں اور حقیقت کا سایہ شمار کرتے ہیں اور ہر ایک چیز کو ظاہری طور پر جو حقیقت سمجھتے ہیں اس کی نسبت خدا کی طرف دیتے ہیں۔ ایک عارف کے نظریہ کے مطابق ہر چیز کی شان، صفت اور اسم خداوند متعال ہے۔ ہم جب چیزوں کو خدا کے مقابل میں لائیں تو اس کو ایک اور چیز سمجھتے ہیں۔ وہ صرف اسے حقیقت اور باقی چیزوں کو دوسری چیزیں سمجھتے ہیں اور اس کا ثانی قرار دیتے ہیں۔ عرفا کی نظر میں کفر و شرک جہل و حجاب تمام بصورت محض ہیں۔، اگر اس صورت میں مر جائیں تو گمراہی و ظلمت میں مرے ہیں یعنی حقیقت کو درک نہیں کیا ہے۔ انسان اس وقت کامل ہے جب حقیقت کو درک کرے اور حقیقت تک پہنچ جائے۔ عرفا کی اصطلاح ہے وہ کہتے ہیں۔ وصول بحق۔ اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ العیاذ باللہ حق انسان کے اندر حلول کر لیتا ہے کیونکہ محال ہے کہ خدا حلول کرے اور خلق کے ساتھ متحد ہو جائے۔ عرفا اصلاً خدا کا ثانی نہیں سمجھتے۔

شبستری کہتے ہیں:

حلول و اتحاد این جا محال است
کہ در وحدت دوئی عین ضلال است

اگر کہہ دیں حلول تو خدا کا ثانی بنا دیا اور یہ عین شرک ہے یہ وہ چیز ہے جس سے عارف فرار کرتا ہے اور اگر کہہ دیں اتحاد تو پھر دو چیزیں ہیں جو آپس میں متحد ہو گئی ہیں۔ عارف کے نزدیک کوئی چیز نہیں ہے کہ جس کو خدا کا ثانی قرار دیا جائے۔ مخلوق عارف کی نظر میں تجلی (سایہ نوری ہے) خلق کرنا یعنی ظہور ہے۔

بنا براین پہنچنے کا معنی اس میں فنا ہو جانا ہے اور فانی ہونا یعنی انسان کا اس مقام پر پہنچ جانا کہ حقیقت کو جس طرح وہ ہے درک کرے اور اس کے ادراک کے بعد اپنے آپ کو درک کرے اور ہر چیز سے پہلے اس کو درک کرے اور دیکھے۔ ما رایت شیئاً الا و رایت اللہ قبلہ و بعدہ و معہ عارف کی نظر میں من اور ما (کون اور

کیا) باقی نہیں رہتا۔ فانی ہونے کا مطلب یہ ہے۔

تو بس عرفا کے نزدیک اصولی طور پر حقیقت ایک چیز ہے ایک سے زیادہ نہیں ہے اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کا ثانی نہیں ہے بلکہ اس کے جلوے اسماء، صفات اور تجلیات ہیں، کمال انسان حقیقت تک پہنچنا ہے اور حقیقت تک پہنچنا یعنی انسان اس مقام تک پہنچ جائے کہ ہر ایک چیز کے اندر اور ہر چیز کے ساتھ اس کو دیکھے۔ **وھو معکم اینما کنتم** ہر چیز کے ساتھ بلکہ ہر چیز سے پہلے دیکھے اور ہر چیز کی زندگی کو اس کے ساتھ دیکھے اور ہر چیز کو اس میں واقعاً سمجھتا ہو اور اپنے آپ کو بھی ان میں سے ایک دیکھے تو پھر ''میں'' باقی نہیں رہتی یہ وہی معنی فنا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر انسان اس حال تک پہنچ جائے اور یہ فنا اور اتصال پیدا ہو گیا تو ان کے قول کے مطابق ید اللہ الباسطہ ہو جائے گا۔ عرفا پہنچنے کے بھی قائل ہیں۔ سلوک کا معنی یہی ہے۔ سیر الی اللہ اور سلوک الی اللہ اور ہم بھی جو تقرب کہتے ہیں نزدیک ہونے کے معنی میں ہے چونکہ سیر وسلوک حرکت بسوئے خدا اور منازل قرب کا طے کرنا ہے لہٰذا اس کے معتقد ہیں لیکن ان منازل کیلئے بھی نظم خاص کے قائل ہیں جبکہ منازل مکانی کہ جب تک منزل اول طے نہ ہو منزل دوم تک پہنچنا محال ہے۔ عرفان کی منازل بھی معین کی گئی ہے تا کہ انسان حقیقت تک پہنچ جائے۔ عرفا کے نظریہ کے مطابق انسان کا کمال بہت زیادہ روشن ہے جو انسان حقیقت تک نہ پہنچا ہو ناقص انسان ہے، محجوب ہے اور نارسیدہ انسان ہے انسان کی انسانیت اور استعداد اصل یہ ہے کہ حقیقت تک پہنچ جائے اور حقیقت کو پہچان لے، وہ انسان جو راستے ہی میں رہ جائے۔ وہ کسی منزل تک نہیں پہنچ پاتا۔ چنانچہ عرفا کی نظر میں اس سیر وسلوک کا مرکب عشق ہے، محبت ہے، انس ہے راہ عارف قلب و دل کے ساتھ وابستہ ہے نہ کہ فکر و فلسفہ سے ہر دوسرا کمال اور ہر ایک دوسری چیز ان کے نزدیک اس کمال سے منشعب ہونا ہے (یعنی شعبہ شعبہ ہونا) ہر چیز اس کمال کے معتبر ہونے سے وابستہ ہے اور اس

اعتبار سے ہے کہ یا اس کمال تک پہنچ جائے یا اس کمال سے ناشی ہو۔ مثلاً کیا زہد انسان کیلئے کمال ہے، کہتے ہیں ہاں کمال ہے کیونکہ اس راستے کی شرط ہے کیا تواضع کمال ہے ہاں کیونکہ اس راستے کی شرط ہے اور وہ چیزیں جو محاسن اخلاقی ہیں اور ارشاد و ہدایت اچھی صفات ہیں کیونکہ اس کام کے آثار ہیں۔ انسان جب اس منزل تک پہنچ جاتا ہے تو مظہر اسم الھادی ہو جاتا ہے اور دوسروں کو ہدایت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ عرفا کے لئے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کیونکہ ان کے نزدیک کمال حقیقت تک پہنچنے کے برابر ہے۔ حقیقت اور کمال انسان ایک چیز ہے یعنی حقیقت تک پہنچنا ہی کمال ہے۔

۲۔ مفکرین اسلامی اور الٰہی فلسفہ کمال انسان کے بارے میں اور نظریہ رکھتے ہیں اور انسان کامل کی ایک اور طریقے سے تعریف کرتے ہیں۔ جو عرفا کی تعریف سے کچھ فرق رکھتی ہے۔

حکما کے بیان میں مسئلہ وحدت حقیقت اور وصول و سیر و سلوک اور پہنچنا اور فنا ہونا جس طرح عرفا کہتے ہیں، نہیں ہے اور فلسفہ میں اس کا وجود نہیں ہے۔

فلاسفہ کے نزدیک انسان کا کمال دو چیزوں سے وابستہ ہے، ایک درک حقائق بالفاظ دیگر حکمت، کلمہ علم مطلب رسا نہیں ہے۔ عرفا کہتے ہیں ''حقیقت'' اور حکما کہتے ہیں ''حکمت'' اور کا حکمت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں حقائق اشیاء کو درک کرنا اس طرح کہ جس طرح وہ ہیں اور نظام کائنات کا اس طرح درک کرنا جس طرح وہ ہے، البتہ کلی نظام کا درک کرنا، جزئیات کا درک کرنا حکمت نہیں کہلاتا۔ یہ علوم کی شان ہے مثلاً سیب کی خصوصیت کیا ہے۔ علم ہے حکمت نہیں ہے۔ مثلاً کسی عمارت کی شناخت کرنا چاہیں تو اس کی زمین اور اس کے کلیات کو سمجھیں گے اور کبھی عمارت کے جزئیات کو پہچانا جاتا ہے یا تہران کی جگہوں کو پہچاننا، ٹیکسی ڈرائیور گلیوں کو تو اچھی طرح جانتا ہے مگر بطور کلی سارے تہران کے بارے اطلاع نہیں رکھتا، اگر اس سے پوچھیں تہران

کا پانی کہاں سے پورا کیا جاتا ہے یا تہران شہر کی بجلی کہاں کہاں سے حاصل کی جاتی ہے۔شہر داری کا نظام یا پولیس کا نظام کس طرح ہوتا ہے۔نہیں بتلا سکے گا۔حکیم انسان کے کمال کو عالم دنیا کو سمجھنے میں پنہاں سمجھتے ہیں۔تمام عالم ہستی کو سمجھنا صحیح طور پر علم کا سمجھنا اس طریقے پر کہ عالم علمی ہو جائے۔ جہاں نسان ''عینی'' ہو جائے اور یہ عالم'' علمی'' ہو جائے کہ حکمت کی تعریف میں کہتے ہیں۔ صیرو الانسان عالماً عقلیا مضاھیاً للعالم العینی حکمت کی غایت کے اعتبار سے تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں حکمت عبادت ہے انسان کا پھرنا ایک جہان علمی اور جہان عقلانی سے جہان عینی کے مطابق مثلاً جہان عینی میں واجب الوجود، نظام کلی عوالم مجردات متوسط اور مادی ہیں اور ہونے چاہیں اور انسان ان کو سمجھ سکے۔ پس انسان کامل حکما کی نظر میں وہ انسان ہے جس نے حکمت کو پا لیا ہو۔ البتہ حکمت کے مصداق میں ممکن ہے ہم بحث کریں لیکن اصل حکمت میں بحث نہیں کی جا سکتی۔قرآن بھی ارشاد فرماتا ہے

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ

''جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت عطا کی گئی اس نے خیر کثیر پا لیا۔''[1]

پس حکما کی نظر میں کما ل انسان حکمت میں ہے اور دوسرا کمال انسان عدالت میں ہے۔ عدالت سے ان کا مقصود عدالت اخلاقی ہے۔ عدالت اجتماعی تابع عدالت اخلاقی ہے یعنی انسان کی خواہشات کے درمیان تعادل اور توازن برقرار ہونا چاہیے اور قوت عاقلہ کی حکومت میں ہو۔یعنی تمام خواہشات شہواتی اور غضبی اور وہمی پر عقل کی حکومت مسلط ہو اور آج کی اصطلاح میں تمام عزائز و تمایلات پر اس طرح عقل حکومت کرے کہ ہر قوت کو اس کا حصہ بغیر افراط و تفریط عطا کرے یعنی نہ اس

---

[1] سورۂ البقرہ:۲۶۹

کے حق سے زیادہ اس کو عطا کرے اور نہ اس کو حق سے کم عطا کرے۔ چنانچہ حکما معتقد ہیں کہ انسان کے دو جنبہ ہیں۔

جنبہ یدالفوقی اور یدالبدنی جنبہ ید الفوقی کے اعتبا رسے انسان کا کمال حکمت میں ہے اور جنبہ ید البدنی کے اعتبا رسے انسان کا کمال عدالت میں ہے۔ پہلے کو کمال عقل نظری اور دوسرے کو کمال عقل عملی کہتے ہیں۔ پس حکما کے نزدیک انسان کامل وہ انسان ہے جس کی عقل مسائل نظری میں حکیما نہ ہو اور مسائل عملی میں بھی ازنظر اخلاق سو فیصد معتدل ہو کیونکہ معتقد ہیں کہ تمام اچھی صفات کے اچھا ہونے کا مطلب معتدل ہونا ہے یعنی یہ اخلاق ہے کہ اس میں ہر غریزہ اپنے حق عدالت سے لیتا ہے۔ حکما کی نظر کی بنیاد پر حکمت بذات خود ایک کمال ہے اور وہ علم کمال ہے کہ جس علم کی بنیاد حکمت ہو۔ البتہ علم مطلق طور پر حکمت جزئی اپنی جگہ پر ہے پس حکمت کلی کمال ہے نہ مقدمہ کمال۔

کس طرح ابتداء میں ہم نے ایمان کے بارے میں کہا ہے کہ کیا ایمان ہدف ہے یا وسیلہ اور اب حکمت تو کیا حکمت انسان کیلئے ہدف ہے یا وسیلہ اور طبعاً مسئلہ علم کہ آج کا مسئلہ ہے البتہ چند صدیاں پہلے سے یہ مسئلہ پیش نظر ہے کہ آیا علم انسان کیلئے ہدف ہے یا وسیلہ یا ہدف بھی ہے اور وسیلہ بھی۔

آیا علم کمال انسان ہے البتہ اگر کمال ہے تو اس پر مفادات مرتب ہوتے ہیں۔ اصولاً علم مفادات کیلئے ہو تو اچھا ہے اگر مفادات نہ ہوں تو علم کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ ہر وہ علم جس کی منفعت زیادہ ہو زیادہ بہتر ہوتا ہے اور جس کی منفعت کم ہو تو اس کی قدر و قیمت بھی کم ہوتی ہے۔

۳۔ تیسرا نظریہ بھی موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ کمال انسان عواطف میں مضمر ہے، یعنی محبت میں ہے یا کم ازکم محبت بھی کمال انسان کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ حکما کے نزدیک کمال حکمت و عدالت ہے اور عرفا کے نزدیک حقیقت ہے اور یہ

نظریہ جو کہ ایک اخلاقی نظریہ ہے اس میں کمال محبت میں ہے یعنی انسان کامل وہ ہے جس کو دوسروں سے زیادہ محبت ہو۔ جتنا بھی انسان اپنے غیر سے محبت رکھے گا یعنی اپنے علاوہ دوسرے انسانوں سے یا کم ازکم اپنے علاوہ جانداروں سے یا کم ازکم تمام جہان سے محبت رکھتا ہوتو وہ کامل ترین انسان ہے اور اگر اپنے غیر سے محبت نہ رکھتا ہو خواہ تر محبت ہو یا خشک محبت ہو اور انسان خود پرست ہوتو وہ بدتر اور ناقص تر انسان ہے اور یہ وہ انسان ہے کہ جس کا اخلاق مذموم شمار کیا جاتا ہے کیونکہ فاسد اخلاق کا محور خود پرستی ہے۔ پس جتنا بھی انسان خود پرستی سے غیر کی طرف جائے گا اتنا ہی اس کا اخلاق مصنوع ہوتا جائے گا۔ یہ ایک نظریہ ہے جس پر ہندو اعتماد کرتے ہیں اور ان کا عتماد بھی بھی اپنی جگہ پر درست ہے۔ گاندھی نے اپنی کتاب" این است مذہب من" میں اس مسئلہ پر بہت زیادہ اعتماد کیا ہے۔ البتہ ہندو حقیقت پر بھی اور محبت پر بھی اعتماد کرتے ہیں اور مغربی تمدن نے ان دونوں باتوں کو رد کر دیا ہے اور اس طریقے پر تنقید کرتے ہیں۔

۴۔ کمال انسان کے بارے میں چوتھا نظریہ یہ ہے کہ کمال انسان حسن و جمال میں ہے البتہ صرف جسمانی خوبصورتی نہیں ہے خوبصورتی سے مراد روحانی خوبصورتی ہے۔ بالفاظ دیگر اچھے ہنر اور کام اور فعالیتہائے ظریف میں کمال انسان مضمر ہے مگر وہ ہنر و کام جو روح ظریف سے ناشی ہوا ہو۔ تمام چیزوں کو ظرافت و خوبصورتی کے تحت لے آتے ہیں (یہاں تک کہ اخلاق کو جو ہم اچھا کہتے ہیں وہ کہتے ہیں چونکہ زیبا ہے لہٰذا کمال ہے) پس بنا براین کمال انسان زیبائی میں پنہاں ہے۔ البتہ یہ تعبیر جداگانہ ہے وگرنہ درحقیقت بات ایک ہی ہے۔

۵۔ پانچواں نظریہ تقریبا کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظریہ مغربی دنیا میں متداول نظریہ ہے۔ یہاں پہنچ کر کمال انسانی جنبہ مادی پیدا کر لیتا ہے۔ گزشتہ تمام نظریئے جنبہ روحانی رکھتے تھے۔ حقیقت، حکمت و عدالت، محبت، زیبائی، کوئی ایک بھی مادی نہ

تھا۔ اس نظریہ میں کمال انسان کو قدرت میں مضمر سمجھا جاتا ہے۔ انسان کامل یعنی انسان قادر و مقتدر، انسان جتنا زیادہ مقتدر ہوگا اور جتنا طاقتور ہوگا اور اپنے داخل و خارج پر جتنا مقتدر ہوگا یعنی طبیعت اور دوسرے انسانوں پر قادر ہوگا، انسان کامل ہوگا اور ڈراونی تکامل کی بنیاد بھی یہی ہے۔ ڈارون کے معیار کے مطابق کامل تر موجود وہ ہے جو طاقتور موجود ہو جو بہتر طریقے پر اپنی حفاظت کرسکتا ہو اور اپنے مد مقابل کو میدان تنازع میں پچھاڑ سکے۔ لہٰذا ڈارون پر اعتراض کیا گیا ہے کہ اس نے اصل تنازع بقا کے ذریعے اخلاق بطور کلی ختم کر دیا ہے چونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ کمال اسی میں ہے۔ اس میں اخلاق کی بنیاد متزلزل ہو جاتی ہے اور یہ وہی چیز ہے جس کو اہل عرب اپنی تبلیغات میں بڑے طمطراق کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور کہا ہے کہ ہم نے بڑی دریافت کی ہے اور ہزار سالہ گزشتہ اشتباہات کو ختم کر دیا ہے اور وہ یہ تھا کہ دوسرے جو علم کے پیچھے جاتے تھے غور نہیں کرتے تھے کہ علم کو کیوں حاصل کرتے ہیں لیکن ہم کہتے ہیں کہ علم وہ ہے کہ انسان کے کام آئے اور انسان کے اندر قدرت کو زیادہ کرے اور انسان کو فطرت پر زیادہ سے زیادہ مسلط کر دے۔ اس وجہ سے سائنسی علم کے پیچھے گئے ہیں۔ ایسا علم جو انسان کیلئے بہترین اوزار ثابت ہو اور اس تربیت کے ساتھ انہوں نے تمدن اور صنعت میں ترقی کی ہے۔ البتہ یہ ترقی کرنا درست ہے لیکن فائدہ حاصل کرنے سے زیادہ نقصان کیا ہے اور جہاں مسئلہ حقیقت، حال حقیقت عرفا، کچھ نہیں ہے۔ مسئلہ حکمت بعنوان کمال اور علم بعنوان یک کمال کہ خود ایک قداست اور مرتبہ ہے، قداست سے نیچے گر گیا اور کمال نہ رہا۔ محبت جو کہ کمال انسان شمار ہوتی ہے قداست اور بزرگی سے گر گئی ایمان جو قداست شمار ہوتا ہے اپنی قداست سے گر گیا، تمام چیزیں قدرت کا مقدمہ بن گئیں اور اس بشریت کے راستے کو بدل دیا۔ اس دن سے بشریت جتنا بھی دعویٰ کرے کسی معنویت کی معتقد نہیں ہوسکتی۔ اگر عمل کا دعویٰ کریں تو بر خلاف عمل کرتے ہیں۔ پہلے کہہ دیا ہے کہ فلسفہ پر اعتراض

کرتے ہیں اور افکار فلسفہ کو افراطی سمجھتے ہیں کہ عجیب وغریب باتیں بھی کی ہیں لیکن پھر بھی قابل اعتراض نہیں ہے۔ نیچرل اور صریح تر کہا گیا ہے۔ اصولاً علم راستے کے بدلنے کا نتیجہ جو کہ بیکن کے ذریعے سے ہوا ہے یہ ہے کہ اخلاق میں تمام کو کہہ دیں کہ نیچر نے کہا ہے اور منطقی نتیجہ اس راستے کا جس کو بیکن نے اختیار کیا ہے اور علم کو قدرت کی حذمت قرار دیا ہے اور کمال انسان کو صرف قدرت میں منحصر سمجھا ہے یہی نیچر کے نظریات اخلاق اور مسائل اجتماعی میں ہیں۔

پانچویں تقریر

اسلام کا اصلی ہدف

ہماری بحث یہ تھی کہ انسان کے بارے اسلام کا اصلی ہدف کیا تھا اور یہ کہ اسلام کی نظر کمال انسان کے بارے کیا تھی۔ انسان کامل اسلام کی نظر میں کیسا ہوتا ہے، طبعی بات یہ ہے کہ جب کوئی حکمت یا دبستان یہ چاہے کہ اپنے راستے کو واضح کرنے کیلئے اور اپنے ارادے کو ظاہر کرنے کے ذریعے سے اپنے پیرووں کی تعداد میں اضافہ کرے تو وہ یہی کام کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ نہیں ۔ پس مجبوراً اپنے ہدف کو اپنے مکتب میں اپنے پیرو کاروں کیلئے متعارف کرتا ہے اور کہتا ہے اس ہدف کے پیچھے چلو۔ یہ ہے ہدف اسلام انسان کامل سے طبعی طور پر جو کہ برابر ہے ہدف واقعی کے کہ جس کو ایک مسلمان کو چاہیے کہ اپنے کاموں کیلئے رکھتا ہو۔

بنابراین جب اسلام میں انسان کامل کے بارے بحث کی جاتی ہے تو فی الواقع اسلام کے اصلی ہدف کے بارے بحث اسلامی آئیڈیالوجی میں کی جاتی ہے تا کہ مطلب واضح ہو کر سامنے آ جائے۔ وہ مختلف نظریات جو کہ انسان کامل اور کمال انسان کے بارے میں ہیں ان کو پہلے بیان کریں تا کہ معلوم ہو جائے کہ ان میں سے اسلام کسی کی تائید کرتا ہے یا جدا گانہ طور پر کوئی نظریہ رکھتا ہے۔ خلاصہ کے طور پر کہہ دیا ہے اور عرفا کے نظریہ کو پیش کر دیا ہے جنہوں نے انسان کامل کے بارے بہت

زیادہ بحث کی ہے اور انسان کامل والاعنوان بھی انہوں نے ہی قائم کیا ہے۔ چنانچہ جہان بینی عرفانی میں حقیقت واحد ہے اور بس اور وہ حقیقت واحد مساوی ہے ذات حق کے ساتھ اور مخلوقات ذات حق کی تجلیات ہیں ۔یعنی ذات حق کے مقابلے میں کوئی مخلوق نہیں ہے اور انسان جو کہ جامع ترین مخلوق ہے اور عرفا کی نظر میں کامل ترین مظہر اسما و صفات الٰہی ہے۔ انسان کا کمال انہی اصل کی طرف بازگشت میں ہے۔ پس وہ حقیقت کو واحد یعنی ذات حق سمجھتے ہیں اور اس کے علاوہ تمام چیزوں کو ذات حق کا سایہ سمجھتے ہیں، یعنی نمود جانتے ہیں۔ اپنی نسبت سے وہ خود امور حقیقی ہیں۔ ذات حق کی نسبت کے اعتبار سے ان کی اپنی اصطلاح کے مطابق شئے کی نسبت شئے کے ساتھ نہیں ہے بلکہ نسبت شی وفی ہے جب حق کے بارے بحث ہوتو وہ حق مطلق ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی چیز حق نہیں ہے وہ اعتقاد رکھتے ہیں مگر انسان کیلئے میسر ہے کہ وہ وصول بحق یا فنا درحق ہو جائے اور انسان حکمی تشبیہ میں ایسا موجود ہے جو کہ اپنی اصل سے جدا ہوا ہے اور ان کے قول کے مطابق غربت میں زندگی گزار رہا ہے اور کمال سعادت انسان یہ ہے کہ اپنے اصلی وطن کی طرف جائے جو کہ ذات حق ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡن۔ وہ اس راستے اور اس کے وسائل کے معتقد ہیں لیکن اس راہ کو تمام وجود انسان سمجھتے ہیں، یعنی انسان کے دل اور اس کی تبدیلیوں کو سمجھتے ہیں اور بقول ان کے انسان کثرت سے دور ہو کر حجابوں میں چلا جاتا ہے۔ پھر جا کر وحدت کامل تک پہنچ پاتا ہے اور ان کی نظر میں عشق عبادت اور تزکیہ نفس اس راستے کا مرکب ہے۔

لیکن حکمائے الٰہی اس قسم کی فکر نہیں رکھتے اور ان کی نظر میں جو ہر انسان عاقلہ انسان ہے۔ اصولاً انسان واقعی وہی عاقلہ انسان ہے اور باقی سب شاخیں ہیں۔ انسان کا کمال قوت عاقلہ کے کمال میں پنہاں ہے اور قوت عاقلہ کا کمال جبکہ دو جنبے رکھتی ہے نظری وعملی، جنبہ نظری میں کمال حکمت یعنی حقائق اشیا (چیزوں کی حقیقتوں کو) دریافت کرنا کہ جس طرح ہیں اور جنبہ عملی میں عدالت ہے اور عدالت سے ان کا مقصد

وجود انسان پر عقل کا حاکم ہونا ہے اور کوئی قوت وجود انسان پر حاکم نہ ہو اور تمام قوت عقل کی محکوم ہوں، باب اجتماع میں افلاطون کا ایک فریضہ ہے جو کہ معتقد ہے کہ ایک شہر کا اجتماع تب ہوسکتا ہے جب فلاسفر اور دانشمند حاکم ہوں اور فلسفہ کے حاکم اسی فرضیہ کو فرد پر لاگو کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی فرد اس وقت سعادت مند ہوتا ہے جب اس کے وجود پر فلاسفر حاکم ہو،فلسفی حاکم یعنی قوت عاقلہ جو کہ قوت تفکر انسان ہے، انسان کے وجود پر حاکم ہو نہ کہ دوسری طاقتوں میں سے کوئی طاقت حاکم ہو اور حکما کے نزدیک مسئلہ وصول بحقیقت مطرح نہیں ہے۔ ان کی بات فکر و تفکر تک محدود ہے نہ کہ دل اور روح پر اور وفا کا راستہ معلوم ہے اور وہ فکر ہے۔ ایک خیال سے دوسرا خیال سوچتا ہے اور ان سب چیزوں کا مجموعہ قوت عاقلہ ہے۔ عقل،منطق، استدلال کے ذریعے اسے طے کرنا چاہیے اور کہا ہے کہ کچھ لوگ کمال انسان کو صرف محبت میں سمجھتے ہیں اور کامل انسان اس کو سمجھتے ہیں جو دوسروں کی محبت میں کھو جائے اور دوسروں کی محبت میں اس طرح سرشار ہو جائے کہ اپنی ہستی کو مٹا دے۔ اپنے اور ان کے درمیان کوئی حد نہ قرار دے اور جس چیز کو اپنے لئے ناپسند کرے دوسروں کے لئے بھی ناپسند کرے اور جب اپنے اور دوسروں کے درمیان بات آ جائے تو دوسروں کو مقدم کرے۔ پس کمال انسان محبت میں ہے اور اس نظریہ کی بنیاد عواطف عالی انسان ہے۔ جب یہ محبتیں انسان کے اندر رشد کرتی ہیں تو انسان کامل ہو جاتا ہے اور ایک دوسرا مکتب زیبائی اور حسن و جمال پر اعتماد کرتا ہے اور کمال انسان کو حسن و جمال میں سمجھتا ہے اور تنہا جسمانی خوبصورتی نہیں کیونکہ جسمانی حسن و جمال کے زیادہ قائل نہیں ہیں بلکہ زیبائی معنوی اور اخلاق عالی کہ جس کو اس وجہ سے کمال سمجھتے ہیں کہ زیبا ہے اور فضیلت ہے۔ اصولاً سقراطی مکتب فضیلت میں باب اخلاق میں اسی جگہ سے شروع ہوتا ہے کہ فلاح چیز صاحب فضیلت ہے تو حسن عقل مراد ہے۔ یعنی عقلی زیبائی یعنی جو مکتب فکر اخلاق کو حسن و قبح عقلی پر پرکھتا کرتا ہے اور سقراطی اخلاقی مکتب فکر اسی بنیاد پر

فضیلت کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ ہاں اچھا ہے کیونکہ خوبصورت ہے۔ پس خوبصورتی سے بالاتر ان کے ہاں کوئی بات نہیں ہے اور امورعقلی میں اچھا ہونا یعنی امور حسی میں اچھا ہونا ہے۔ ایک خوب حسی اور ایک خوب عقلی ہے (یعنی ایک حسی خوبصورتی اور ایک عقلی خوبصورتی) ان کے فکر کے مطابق علم بھی کمال ہے کیونکہ زیبا ہے یعنی جہالت بد صورتی اور علم خوبصورتی ہے اور قدرت بھی اسی طرح ہے لہٰذا اخلاق سقراطی میں تمام چیزیں دو رخ رکھتی ہیں ایک خوبصورتی دوسرا بدصورتی اور حسن و قبح عقلی پر اعتماد رکھتا ہے۔ آخر میں عقلی خوبصورتی کی طرف پلٹتا ہے۔

شعر و ہنر ایجاد و ابداع کہ حقیقت میں خلق زیبائی ہے۔ پلٹتا ہے زیبائی کی طرف کیونکہ خالق جب تک خوبصورت نہ ہو خوبصورتی کو کس طرح خلق کر سکتا ہے جب تک روح انسان زیبا نہ ہو گا کس طرح خوبصورت شعر کہہ سکتا ہے یا نقاشی زیبا ایجاد کر سکتا ہے۔ سلاطین قاچاری میں سے ایک سلطان نے ایک شعر کہنا چاہا تو ایک مصرع کہہ دیا مگر دوسرا مصرع نہ کہہ سکا، تو شعراء کو بلایا تو ہر ایک شاعر نے اپنا اپنا مصرع پیش کیا۔ ایک شاعر کا مصرع سلطان کو بہت پسند آیا اور وہ جیت گیا، چنانچہ بادشاہ کا مصرع یہ تھا۔

در جہان چون حسن یوسفؑ کس ندید

اس کا دوسرا مصرع نہ کہہ سکا تمام شعرا نے کچھ نہ کچھ کہا، چنانچہ ایک شاعر نے یوں کہا

حسن آن دارد کہ یوسف آفرید

یہ مصرع تمام سے بہتر تھا اور درحقیقت ہے بھی اسی طرح جب تک بنانے والا حد درجہ کی خوبصورتی نہ رکھتا ہو گا تو وہ کس طرح زیبائی اور خوبصورتی کو وجود میں لا سکتا ہے۔

بنا براین اگر کسی نے خوبصورت شعر کہا ہو تو وہ خوبصورت اثر ایجاد کرتا ہے

کیونکہ اس کی روح میں اعلیٰ درجے کی زیبائی اور خوبصورتی پائی جاتی ہے یہ مختلف نظریات تھے جن کو بیان کر دیا گیا ہے۔

اب اسلامی نقطہ نظر کو دیکھتے ہیں کہ اسلام کیا کہتا ہے۔ یہ مسائل قابل توجہ ہیں کیونکہ ایسی مباحث کو زیر بحث نہیں لایا جاتا۔ یعنی آج کی اصطلاح میں متروک و خام ہیں۔

آیا اسلام اس حقیقت کی طرف جس کے مفہوم کو واضح کر دیا گیا ہے دعوت دیتا ہے یا نہیں۔ ہم عرفا کے کلام کو سو فیصد قبول نہیں کر سکتے لیکن اس قدر تو ماننا پڑتا ہے کہ وہ خدا جس کے متعلق اسلام نے کہا کہ وہ موجودات میں سے وہ موجود ہے جو دوسرے موجودات پر باپ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ وہ دوسرے موجودات کا خالق ہے ممکن نہیں کیونکہ دوسروں کو پیدا کر کے پھر کیا ہے۔ وہ بچہ اس کے ساتھ رہتا ہے یا یہ کہ خدا تمام مخلوقات کو رزق دیتا ہے۔ ان معنوں میں بہت سے لوگوں کا رزق ایک شخص کے ہاتھ میں ہے۔ ان دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں یا یہ کہئے کہ ارسطو اور اس کے افکار میں کوئی فرق نہیں تھا جو تمام فلسفیانہ افکار کا تحرک ہے۔ بات یوں نہیں ہے۔ خدا وہ چیز ہے جس کے مقابل میں دوسری چیزیں کوئی چیز نہیں ہیں۔ جب وہ حقیقت ہے تو دوسری چیزیں سراب ہیں۔ اس کا ظل اور سایہ شمار ہوں گی۔ جس طرح کہ اس کا اپنا ارشاد ہے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

خدا زمین و آسمان کا نور ہے۔[1]

خدا کے بارے میں یعنی جو کچھ ہے وہ ہے اور باقی تمام چیزیں اس کی وجہ سے ہیں، تمام زمین و آسمان کا نور وہ ہے۔ قرآنی تعبیرات یہی ہیں کہ اصولی طور پر وہ ”حق مطلق“ ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

[1] سورۂ نور: ۳۵

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ [1]

''عنقریب ہم ان کو کائنات میں اپنی نشانیاں ان کے نفسوں میں دکھائیں گے تا کہ ان کیلئے ثابت ہو جائے کہ قرآن حق ہے۔''

نہ اور انہ حق یہ دو کلمے آپس میں بہت فرق رکھتے ہیں۔واقعاً جب ایک مومن خدا پر ایمان لاتا ہے تو باقی تمام چیزیں اس کے سامنے بے قدر و قیمت ہو جاتی ہیں'' نہ'' اس طرح کہ وہ بھی ایک چیز ہو اور باقی چیزیں بھی کوئی چیز ہوں بلکہ تمام چیزیں اس کے سامنے کوئی چیز نہیں ہیں۔

سعدی نے اس مطلب کو بہت اچھے طریقے سے بوستان میں بیان کیا ہے اور حکیم و عارف کی نظر کے تفاوت وفرق کو بیان کیا ہے اور اس طرح کہتے ہیں۔

رہ عقل جز پیچ حد پیچ نیست
بر عارفان جز خدا ہیچ نیست

اور اس کے بعد سوائے خدا کے کچھ نہیں ہے، کی تشریح کرنے کیلئے کہ کیا تمام خدا ہیں یا یہ نہیں ہیں بلکہ صرف وہی ہے۔کہتے ہیں:

تو ان گفتن این با حقیقت شناس ولی فردہ گیرند اصل قیاس
کہ پس آسمان و زمین چیستند نبی آدم و دیو و در کیستند

اس کے بعد جواب دیتے ہیں کہ یہ تمام آپس میں منافات نہیں رکھتے اور کہتے ہیں:

پسندیدہ پر سیدی ای ھوشمند جوابت بگویم درایت پسند
کہ خورشید و دریا و کوہ و فلک بنی آدم و دیو و جن و ملک
معھم مصرچہ ہستد بقرآن کمتر ند کہ باھستیش نام ہستی برند

[1] سورۂ فصلت: ۵۳

اگر وہ ہے تو یہ سب کچھ کوئی چیز نہیں ہیں۔

قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ [1]

بس جب یہی کچھ کہا جائے کہ **اللّٰہ ذرھم** تو اس کا دنبالہ محال ہے کہ کوئی اللہ کو اللہ جانتا ہو، اس کو پہچانتا ہو اور کسی دوسرے قطب کی طرف میلان پیدا کرے اور اصولاً کسی دوسری چیز کو اس کے مقابلے میں لے آئے۔ یہ ہے کہ اسلام میں خدا کے بارے میں جو ایمان ہے بالاتر ہے کسی بھی دوسرے صنائع کے ساتھ تشبیہ سے بلکہ جب وہ ایک حقیقت ہے تو اس کے مقابلے میں کسی دوسری چیز کو حقیقت شمار نہیں کیا جائے گا۔ اس قدر وہ عظیم اور بزرگ تر ہے۔ بنابراین اسلام میں اس ایمان کے بارے بات کی جاتی ہے کہ اگر اس حقیقت پر ایمان ہو جائے تو پھر کسی دوسری چیز کو اس کے برابر حقیقی شمار نہیں کیا جا سکتا۔

البتہ جو کچھ حکما کہتے ہیں تو کیا واقعی طور پر اسلام میں حکمت مطرح ہے یعنی چیزوں کی حقیقتوں کو دریافت کرنا، تو ہمارا نزاع ضروری نہیں ہے کہ ہم اس حکمت کو جس کو حکما مصداق حکمت سمجھتے ہیں۔ سمجھیں یا نہ سمجھیں بلکہ اصل حکمت یعنی اصل حقائق کو اس طرح جاننا کہ جس طرح وہ ہیں تو اس کو اسلام نے پیش کیا ہے۔ اس تعبیر سے بہتر کونسی تعبیر حاصل ہوسکتی ہے کہ ارشاد خدا ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ [2]

اصلاً حکمت بشر کیلئے خیر کثیر شمار کی گئی ہے اور حکمت وہ چیز ہے جو تقریباً کمال کے مساوی ہے۔ خیر ہے نہ کہ صرف نافع یعنی خود حکمت کو اختیار کیا جائے نہ کہ ایسی چیز کو جو دوسری چیز کیلئے اختیار کی جائے۔ عدالت بھی اسی طرح ہے یعنی وہی

---

[1] سورۂ الانعام:۹۱

[2] سورۂ البقرہ:۲۶۹

عدالت اخلاقی البتہ عدالت اجتماعی کا تعلق کمال فرد سے مربوط نہیں ہے اور کمال جامعہ انسان ہے اور ہماری گفتگو مال فردی سے ہے اور یہی مقصود ہے۔ عدالت اخلاق کے بارے اسلام بھی اپنی نظر رکھتا ہے اور اسلام کی نظر عزائز وخواہشات میں ایک معتدل نظر ہے اور ہر طاقت اور قوت کیلئے حصہ داری کا معتقد ہے کہ ہر قوت کو اس کا حصہ دیا جانا چاہیے اور افراط وتفریط سے بچنا چاہیے۔ البتہ تنہا حکومت عقل کو کافی نہیں جانتے اور واقع میں بھی تنہا عقل کافی اور قادر نہیں ہے کہ وہ باقی عزائز وخواہشات پر حکومت کرے۔ ایمان بھی ہونا چاہیے لیکن ہر حال میں طرف دار عدالت ہے لیکن یہ بات کہ انسان پر حاکم وہی انسان کی قوت فلسفی ہے انتہائی کمزور ہے، یعنی صحیح بات نہیں ہے۔ ایمان و ہدف کے بغیر عدالت کو قائم نہیں کرسکتی۔ مختصر یہ کہ جو وجود انسان کے بارے میں بحث کرتا ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا۔ اس لیے ایسے فلسفی کو وجود انسان سے بحث کرنا چاہیے جو ایمان بھی رکھتا ہو۔

البتہ محبت کے بارے اس سے زیادہ اسلام نے کہا ہے۔

احبب لغيرك ما تحب لنفسك واكره لغيرك ما تكره لنفسك

''جو کچھ اپنے لئے پسند کرتے ہو اپنے غیر کیلئے بھی پسند کرو اور جو اپنے لئے ناپسند کرو اپنے غیر کیلئے بھی ناپسند کرو''

ہمارے پاس کتاب کافی میں ایک باب ہے باب تراحم و تعاطف، یعنی مہربانی وعطوفت اور مقابل میں حدیث مشہور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصحاب سے سوال کیا، ای عدی الایمان اوثق کہ کون سا دستگیرہ ایمان محکم تر ہے۔ ہر ایک صحابی نے جواب دیا۔ ایک نے کہا نماز، دوسرے نے کہا روزہ، تیسرے نے کہا حج، جہاد وغیرہ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو سب صحیح ہے مگر ان میں سے کوئی ایک بھی اوثق العرفی نہیں ہے اور محکم ترین دستگیرہ نہیں ہے۔ اصحاب نے سوال کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو پھر کیا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

فرمایا الحب فی اللہ دوسروں سے خدا کی خاطر محبت۔ نہ صرف حب اللہ بلکہ حب فی اللہ۔البتہ حب اللہ سے ناشی ہے لیکن حب فی اللہ و بغض فی اللہ بخاطر خدا کسی کو دوست رکھنا اور بخاطر خدا کسی سے دشمنی رکھنا، یعنی دشمن خدا اور دشمن حقیقت سے دشمنی رکھنا اس کا لازمہ حقیقت کو دوست رکھنا ہے۔، پس یہ تمام اسلام میں ہیں لیکن چاہیے کہ ان کی تحقیق کی جائے تا کہ معلوم ہو کہ ان میں سے کون اصل ہے اور کون فرع ہے، یعنی کیا تمام اصل ہیں یا اصل نہیں ہیں۔البتہ اسلام میں ایک اور چیز ہے اور وہ مسئلہ عبادت ہے۔عبادت خداوند متعال ہے اور یہ خصوصی طور پر قرآن مجید میں آیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿٥٦﴾

میں نے جنوں اور انسانوں کو عبادت کیلئے خلق کیا ہے۔[1]

کہ ایک عنوان غایتی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ہاں اگر فرض کریں کہ کوئی گروہ نہیں ہے جو اس مکتب فکر کا طرف دار ہو کہ انسان کو عبادت کیلئے خلق کیا گیا ہے اور ہدف انسان اور کمال انسان صرف عبادت ہے لیکن بہر حال قرآن میں اس مطلب کو ذکر کیا گیا ہے اور یہ مطلب قرآن میں وجود رکھتا ہے۔ پس اس موضوع کو لازمی طور پر زیر بحث لایا جانا چاہیے۔ پہلے ہم نے ایک دوسرے نظریہ کو بیان کیا ہے اور بہتر ہے کہ اس کی طرف اشارہ کر دیا جائے اور وہ نظریہ مادی بہرہ برداری ہے البتہ یہ کمال انسان اور وجود انسان کامل کی نفی کرتا ہے کیونکہ کہا ہے کہ انسان کا ہدف اور اس کا مقصود جہاں احسن زندگی گزارنا ہے اور اس سے بھی مقصود بہرہ برداری ہے۔ اصولاً انسان کا ہدف اس دنیا میں بہتر بہرہ برداری ہے اور ہر چیز بہرہ برداری کے معیار پر انسان کیلئے اچھی ہوتی ہے۔علم بھی اس اعتبار سے انسان کیلئے اچھا ہے کہ انسان کیلئے وسیلہ ہے یعنی انسان کو قدرت اور طاقت عطا کرتا ہے جو کہ بہت زیادہ بہرہ برداری کا منشا ہے۔ پس تکامل انسان یعنی بہرہ برداری میں تکامل اور بہتر بہرہ برداری کے شرائط

---

[1] سورۂ ذاریات:۵۶

کو پانا تا کہ بہرہ برداری میں تکامل حاصل ہو جائے۔ چنانچہ زمانہ بیکن سے بشر کا راستہ تقریبا اس طرف انہی جہات کی طرف آیا ہے۔خصوصاً آج جو ترقی و تکامل یافتہ معاشرہ کہا جاتا ہے تو کونسی چیز نگاہ کے سامنے آتی ہے۔کیا وہ معاشرہ جوحقیقت کے نزدیک پہنچا ہو یا ایمان دار معاشرہ ہو؟ یا حکمت و عدالت میں ترقی یافتہ ہو؟ یا محبت میں زیادہ ہو؟ کیا ایسا معاشرہ مقصود ہے بلکہ معاشرہ جو زیادہ بہرہ برداری کرتا ہو۔ صنعت میں ترقی یافتہ ہو۔ یا ایسا علم جوصنعت میں اس کی مدد کرے اورصنعت بھی جو زندگی اور انسان کومرتب کرے اور انسان کو جہان میں بہتر بہرہ بردار سے بس اتنا مفاد حاصل کیا جاتا ہے کہ انسانی بدن کو رشد حاصل ہو سکے اور پھر یہ وہ چیز ہے جو ایک گھاس کے درمیان ایک مشترک ہے انسان کی غذا صحیح ہو کیونکہ ہمارے اور گھاس کے درمیان ایک مشترک امر ہے۔شہوتی تقاضے صحیح ہوں کیوں کہ انسان اور حیوان کے درمیان مشترک ہیں۔ اس سے بالاتر بہرہ برداری کے قائل نہیں ہیں۔ پس انسان کا کمال نباتی وحیوانی کمال کے علاوہ نہیں۔علم بھی انسان کیلئے ایک شاخ کا حکم رکھتا ہے۔ یعنی وسیلہ ہےطبیعت سے نزاع کیلئے یا دوسرے انسانوں کے ساتھ نزاع کرنے کیلئے ۔

اب عبادت کے مسئلے کو سامنے لاتے ہیں،عبادت کس کیلئے۔ اس مقام پر دو مطلب ہیں۔

ا۔ ایک تو عوام کا تصور عبادت، پس انسان عبادت کیوں کرے یا ہم کہتے ہیں خدا ہم کو قیامت کے دن بہت زیادہ اجر عطا کرے اور اس دنیا میں ہم زیادہ بہرہ برداری کریں۔ اس بات کی برگشت بہرہ برداری کی طرف ہو رہی ہے۔ اگرچہ اس جہان میں نہ اُس جہان میں۔ حدود و مراتب ایک ہیں البتہ اس جہان کی بہرہ وری محدود ہے۔ہم عبادت کرتے ہیں تا کہ اس جہان میں بہرہ ور ہوں اور بہرہ وری سے مراد ہماری یہی دنیا والی بہرہ برداری ہے۔ البتہ وہاں کی بہرہ برداری کامل تر اور زیادہ ہوئی جبکہ حور وقصور۔ سیب و ناشپاتی وغیرہ ۔ اگر مراد یہی ہے تو اس کو کہہ چکے ہیں لیکن

کمال انسان کو حیوانی کمال سے زیادہ تصور نہیں کیا اور انسان کو دوسرے جہان میں باقی رہنے والا موجود تصور کیا ہے اور ایسا حیوان جو اس دنیا میں بھی حیوانی زندگی کو باقی رکھے گا اور انسان کیلئے دوسرا کوئی کمال نہیں ہے لیکن ہم عبادت کا ایک دوسرا مفہوم لیتے ہیں اور وہ مفہوم جناب امیر المومنینؑ کی تعبیرات میں موجود ہے اور وہ عبادت الاجرا یا عبادت العبید لیکن عبادت الاحرار نہیں ہے۔ عبادت الاحرار میں عبادت اس قسم کی بہرہ برداری کی ہرگز وسیلہ نہیں ہے۔ جس طرح کہ مادی اور جسمانی مصیبتوں کیلئے رہائی کا وسیلہ نہیں ہے تو نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں۔

ان قوماً عبد واللہ(طلباً) للجنة، مثلك عبادة الاجراء و ان قوماً عبدواللہ خوفاً فتلك عبادة العبيدو قوماً عبدواللہ عبادةالاحرار۔

بالکل فرق ہے۔

تو پس اگر اس کو کہیں تو مسئلہ کمال انسانی شہوات حیوانی سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ دوسرے جہان میں وہ حاصل ہو بلکہ یہ عبادت، شاکرانہ، محبانہ، عاشقانہ عبادت کی حد تک پہنچ جاتی ہے اس وقت عبادت عشق کے مقام تک پہنچ جاتی ہے ۔ حقیقت کی نسبت سے اس وقت خدا ایک وسیلہ نہیں ہے انسان کی زندگی کیلئے اگرچہ آخرت کے اعتبار سے ہو بلکہ خدا ایک حقیقت ہوگا اور وہ مطلوب حقیقی بن جائے گا۔

یا غاية امال العارفين۔یا ولی المئو منين یا غاية امال العارفين ويا حبيب قلوب المئومنين و الصادقين۔

پس اس مقام پر آ کر اس نظر سے مسئلہ عبادت آ جاتا ہے مسئلہ حقیقت تک جو کہ خود ایک حق پرستی ہے، البتہ خود عبادت انسان کیلئے بنیادی طور پر موضوعیت رکھتی ہے۔ ماعبدتک خوفاً من نارك ولا طمعاً فی جنتك بل و جدتك اهلاً

للبعادۃ فعبد تک اس مقام پر آ کر عبادت بلندی اور اوج پکڑتی ہے یعنی زمین سے آسمان تک فرق رکھتی ہے یعنی وہ عبادت کہ جس میں خدا اور عبادت اس جہان کے مفاد کیلئے انسان کی خواہشات حیوانی کیلئے وسیلہ بنے وہ عبادت کہاں اور وہ عبادت جو خود پرستی ہو جو کہ انسان کیلئے اصالت رکھتی ہے وہ کہاں ہے۔

پس نظریہ عبادت بالآخر یہاں پہنچ جاتا ہے کہ عبادت کے مراتب ہیں اور اس مال میں عبادت حیوانی شہوات کا آخرت میں نسبت عبادت نہ کرنے کے اور مادیات کے ساتھ چسپاں ہونے سے ایک کمال ہے چونکہ حد اقل انسان نے خدا کو واسطہ بنایا ہے اور وہ بھی ہمیشہ رہنے والے معاملہ کیلئے اور یہ ہوا پرستی اور نفس پرستی کی نسبت بہت بڑا کمال ہے لیکن اس اور اس عبادت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

پس جب یہ کہا وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۝ اور دوسری طرف کہا۔ عبادت مراتب رکھتی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ عبادت کا مرتبہ سافل نہیں بلکہ مرتبہ عالی مراد ہے۔ پس جو اس مرتبہ عالی تک نہ پہنچ سکے اس کے لئے نہ ہونے سے یہ مرتبہ سافل بہتر ہے۔ ابن عباس کی تفسیر میں آیا ہے کہ لیعبدون یعنی الی لیصر فون اور جس طرح ہم نے عبادت کا معنی کیا ہے۔ یہ دونوں ایک ہو جاتے ہیں چونکہ عرفان یہاں معرفت کامل اور شہود حق کو کہا گیا ہے اور جو عبادت اس مرحلہ پر ہو جب تک اس قسم کے عرفان کے ساتھ نہ ہو تو عبادت عمل پذیر نہ ہو گی۔ بچگانہ اور عوامانہ معرفت کے ساتھ عبادت یہ نتیجہ نہیں دیتی۔ پس عبادت کی برگشت ایمان کی طرف ہوتی ہے اور ایمان کی برگشت حقیقت کی طرف ہوتی ہے۔ اسلام نے یمان و عبادت کی طرف جو دعوت دی ہے وہ ایمان جس میں ادراک حقیقت ہو اور عبادت بھی وہ عمل جو حقیقت پر مشتمل ہو اور حکمت و عدالت کی طرف جو دعوت دی محبت کے ساتھ دعوت دی ہے اور جمال و زیبائی کے ساتھ دعوت دی ہے۔ ان اللہ جمیل و یحب الجمال کافی میں ایک باب ہے جس کا عنوان باب التجمل و الزینۃ ہے۔ اسلام

نے ان سب کی طرف دعوت دی ہے لیکن کون ہدف اصلی ہے تو کیا یہ سب ایک عرض میں ہدف شمار ہوتے ہیں یا ہدف اصلی ایک چیز ہے اور ان میں سے دوسرے اس ہدف کا مقدمہ لازمہ ہیں جبکہ عبادت اس ہدف تک پہنچنے کا مقدمہ ہے یا محبت کا وہ بھی اس ہدف تک پہنچنے کا مقدمہ ہے یعنی اگر کوئی حقیقت تک پہنچ جائے تو اس حقیقت کے تمام آثار سے محبت اور عشق کرے گا۔

بجہان خرم از آنم کہ جہان خرم از او است
عاشقم برہمہ عالم کہ ہمہ عالم از او است

یعنی اس دلیل کے ساتھ کہ سارا عالم اس کا بنایا ہوا ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ ہدف وہی حقیقت ہے یعنی خدا خود ہدف ہے۔ اسلامی نظریات میں ہدف ایک ہے اور وہ خدا کی ذات ہے۔، اصولی طور پر اسلامی توحید بس یہی ہے۔ اسلامی توحید اگر کسی دوسرے ہدف کا تعارف کراتی ہے مثلاً حصول جنت یا جہنم سے بچنا تو یہ دوسرے نمبر کے اہداف ہیں انسانوں کیلئے جو جہنم سے رہائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ورنہ حکمت اس نظر سے کہ وہ حکمت ہے قطع نظر اس سے کہ وہ انسان کو خدا تک پہنچائے ہدف نہیں ہے۔ ہاں حکمت اگر انسان کو حقیقت تک پہنچاتی ہے وگرنہ اس طرح نہیں کہ خود مطلوب بالذات ہو۔

عدالت بھی اسی طرح ہے۔ عدالت بھی اس وجہ سے اچھی ہے کہ نفس امارہ کو روکتی ہے اور یہ حقیقت تک پہنچنے والی تمام رکاوٹوں کو ختم کر دیتی ہے جب تک انسان کا بدنی ملک متعادل ملک نہ ہوگا سیر الی اللہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ محبت بھی شاید اثر ہو نہ کہ مقدمہ۔ یعنی وصول حقیقت کا لازمہ ہو، بہر حال اسلامی نقطہ نظر سے ایمان ہدف ہے نہ کہ وسیلہ، یہ تمام گفتگو کا خلاصہ ہے۔ ایک سوال ہے کہ جب ہم یہ کہتے

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا [1]

---

[1] سورۂ النساء: ۱۳۲

تو آیا ایمان ہدف ہے یا وسیلہ،تو اس بات میں شک نہیں ہے کہ ایمان کے بہت زیادہ آثار ہیں لیکن کیا ایمان کو اس کے آثار کی وجہ سے کہا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ ایمان دار ہوتا کہ اضطراب سے رہائی حاصل کر سکے۔ ایمان رکھتا ہوتا کہ کہ تجاوز نہ کرے۔ ایمان داری ہوتا کہ ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھا جائے تو کیا ایمان انکا مقدمہ ہے یا یہ سب اس کے آثار ہیں اور ایمان ان سے قطع نظر خود ہدف ہے کیونکہ ایمان ہی کے ذریعے انسان حق وحقیقت کے ساتھ متصل رہ سکتا ہے۔ پس ہماری نظر میں خدا پر ایمان خود ہدف ہے اور بالفاظ دیگر خود ہدف ہے اور باوجود اس کے کہ اسلام میں ایمان کے بہت زیادہ آثار ہیں اس دلیل کی وجہ سے واجب نہیں ہوا کہ اس کے آثار پیدا ہوں چونکہ وہ آثار اور فوائد ایمان کے ہیں۔ ایمان اس وجہ سے واجب ہوا ہے کہ انسان کا ایمان کے ذریعہ حق کے ساتھ اتصال ہوتا ہے اور نفس اتصال کہ انسان کا حق کے ساتھ ہوتا ہے اسلام کی نظر میں کمال نسان ہے۔ نہ علم ہدف ہے علم ایک معنی کے اعتبار سے وہی حکمت ہے کہ اشیا کے حقائق کے بارے اہم ہے۔ نہ زیبائی ہدف ہے نہ عدالت ہدف ہے نہ محبت ہدف ہے نہ خوبصورتی بلکہ ہدف صرف خدا اور حقیقت ہے لیکن ایسی حقیقت ہے جو دوسری چیزوں سے متصل ہے یا تو باب مقدمہ یا باب نتیجہ سے۔

یہ ہماری بحث ہے کہ اسلامی آئیڈیالوجی میں آخرین ہدف اور اصلی ہدف سوائے خداوند کریم کے کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ اس وجہ سے اعلیٰ و بلند مرتبہ عبادت انسان کیلئے خدا سے متصل ہونے کا وسیلہ ہے نہ کہ انسان کیلئے دوسری چیزوں کے ساتھ متصل ہونے کا۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ